صد برگ

پروین شاکر

امّی کے نام

صد برگ تک آتے آتے منظر نامہ بدل چکا تھا ـــــ میری زندگی کا بھی اور اُس سرزمین کا بھی جس کے ہونے سے میرا ہونا ہے ـــــ رزم گاہِ جاں میں ہم نے کئی معرکے ایک ساتھ ہارے اور بہت سے خوابوں پر اکٹھے مٹّی برابر کی ـــــ شامِ غریباں کی پینٹنگ کیسی بنے گی؟ کُوفہ شہر کے منارے سبز تو نہیں ہو سکتے نا سچائی جب مُخبروں میں گھِر جائے تو گفتگو علامتوں کے سُپرد کر دی جاتی ہے ـــــ

ایک بار پھر ـــــ صد برگ اور آپ اکٹھے ہو رہے ہیں!

ـــــــ

پروین شاکر

صدبرگ

رزقِ ہوا.....

زندگی کے دشتِ بلا میں سچائی جب اپنے وقتِ عصر کو پہنچ جائے تو کون و مکاں میں صرف ایک پکار باقی رہ جاتی ہے...... ہل من ناصر ینصرنا...... ہل من ناصر ینصرنا.......

لیکن جس معاشرے میں قدروں کے نمبر منسوخ ہو چکے ہوں اور درہم خودداری، دینارِ عزّتِ نفس کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلیں، وہاں نیکی کی نصرت کو کون آئے؟ وہاں تو سماعتیں بہری اور بصارتیں اندھی ہو جاتی ہیں...... اور میرا گناہ یہ ہے کہ مَیں ایک ایسے قبیلے میں پیدا ہوئی جہاں سوچ رکھنا جرائم میں شامل ہے، مگر قبیلے والوں سے بھُول یہ ہوئی کہ انھوں نے مجھے پیدا ہوتے ہی زمین میں نہیں گاڑا (اور اب مجھے دیوار میں چن دینا اُن کے لیے اخلاقی طور پر اتنا آسان نہیں رہا!) مگر وہ اپنی بھُول سے بے خبر نہیں، سو اب مَیں ہُوں اور رہونے کی مجبُوری کا یہ اندھا کنواں جس کے گرد گھومتے گھومتے میرے پاؤں پتھر کے ہو گئے ہیں اور آنکھیں پانی کی ـــــ کیونکہ مَیں نے اور لڑکیوں کی طرح کھوپے پہننے سے انکار کر دیا تھا! اور انکار کرنے والوں کا انجام کبھی اچھّا نہیں ہُوا!

ہر انکار پر میرے جسم میں ایک میخ کا اور اضافہ ہو گیا ـــــ مگر میخیں ٹھونکنے والوں نے میری آنکھوں سے کوئی تعرّض نہ کیا ـــــ شاید وہ جانتے تھے کہ انھیں بُجھانے سے میرے اندر کی روشنی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، یا پھر اپنی سفّاکیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لیے وہ ایک گونگے گواہ کے طالب تھے اور مَیں حیران ہُوں کہ اس گواہی سے میری آنکھیں اب تک پتھرائی کیوں نہیں!

سنگینوں میں پروئے ہُوئے بچّے اور نیزوں پہ سجے ہُوئے جوان سر، میری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہے ـــــ اور مَیں قتل ہونے والوں کے نام تک نہیں پوچھ سکی ـــــ کہ ایسا کرنے میں وفاداریاں مشکوک ہو جاتی ہیں۔ مرگِ انبوہ تو یوں بھی جشن کا سماں رکھتی ہے ـــــ سو تماشا دیکھنے والوں میں میری آنکھیں بھی شامل رہیں!

بستی میں برفباری ہُوئی، تو لوگوں نے اپنے ہاتھ تاپنے کے لیے گھر ہی جلا دیے اور جب تمام بستی شعلوں کی لپیٹ میں آ گئی، تو سارے ہاتھ بلند تھے، مگر کسی کو سورۃ ابراہیم یاد نہ تھی!

بہار کی دُھوپ جب شہر کا رنگ جلانے لگے، تو سُورج سے حرارت کی بجائے پناہ مانگی جاتی ہے، لیکن بارشیں ہُوئیں، تو کھُلا کہ اپنے شہر کا رنگ ہی کچّا تھا!

اور رہا شہرِ جاں، تو سُرخ انگور سے چھنی ہُوئی سرد ہَوا نے جس کی گلیوں میں گلابی اُچھال دی تھی، بہار کی پہلی بارشوں نے جسے اس طرح چُوما تھا کہ زندگی سبز روشنی میں نہا گئی تھی، بادِ شمال نے جھوم کر ہرے موسموں کے تن میں کہیں رگِ تاک کھول دی اور محبت کی اوک سے زندگی کو خوشبو پلا رہی تھی، جہاں وجُود کی بے ہُنر جڑوں تک نمو کی شبنم کچھ اس طرح اُتر گئی تھی کہ بے برگ و بے ثمر شجر پھُولوں کے بوجھ سے جھک جھک گئے، جہاں وجُود کے سرمدی دُھندلکے میں آب و آتش کچھ یوں بہم ہُوئے کہ ہَوا نے مٹّی کے آگے سر جُھکا دیا اور قدموں کے نیچے تاروں کی طرح بچھی ہُوئی رات، ساقی سے کچھ یوں مل گئی کہ سُپردگی کا نشہ تا عُمر ٹُوٹتا نظر نہیں آتا تھا......

مگر جب زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی، تو سنڈریلا کی جُوتیاں ہی غائب تھیں، نہ وہ خواب تھا، نہ وہ باغ تھا، نہ وہ شہزادہ، اچھے رنگوں کی سب پریاں اپنے طلسمی دیس کو اُڑ چکی تھیں اور لہُولہان ہتھیلیوں سے آنکھوں کو مَلتی شہزادی جنگل میں اکیلی رہ گئی —— اور جنگل کی شام کبھی تنہا نہیں آتی! بھیڑیے اس کے خاص دوست ہوتے ہیں! شہزادی کے بچاؤ کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اسے ایک ہزار راتوں تک کہانی کہنی ہے... اور ابھی تو صرف ۲۷ راتیں ہی گزری ہیں!

مادر زاد منافقوں کی بستی میں زیست کرنے کا اور کوئی ہُنر نہیں —— اور ہَوا سے بڑھ کر اور کون منافق ہوگا کہ جو صُبح سویرے پھُول کو چُوم کر جگاتی بھی ہے اور شام ڈھلے اپنے حریص ناخنوں سے اُس پنکھڑیاں بھی نوچ لیتی ہے —— قیمتِ شگفت چکانے میں جاں کا زیاں تو ایسی کوئی بات نہیں، مگر یہ پنکھڑی پنکھڑی ہو کر در بدر پھرنا یقیناً دُکھ دیتا ہے —— ہوا کا کوئی گھر نہیں، سو وہ کسی سر پر چھت نہیں دیکھ سکتی!

—— محبتیں آندھیوں سے منسُوب نہ سہی، مگر ہَوا کے ہوتے ہُوئے ثمر کا شجر سے ربط رہنا بھی محال ہے —— لیکن شجر کتنا ہی ویران کیوں نہ ہو، اُمیدِ بہار پیوستہ ہے، پھُول کتنا ہی پامال کیوں نہ ہو، اچھّے دنوں پر یقین کرنے والے، کوئی نہ کوئی شگون لے ہی لیتے ہیں۔ صد برگ بھی تمام تر ریزہ ریزہ ہونے کے باوصف، اسی یقین پر مُہرِ اثبات ہے —— اور اس یقین کی کوئی ننھّی سی کرن آپ کے دل تک بھی اُتر سکے، تو میَں سمجھوں گی کہ میرے وجُود کی ایک پنکھڑی رزقِ ہَوا ہونے سے بچ گئی!

جنوری ۱۹۸۰ء

پروین شاکر

جلا دیا شجرِ جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رُت میں ہرا ہو، یہ وہ درخت نہ تھا

وہ خواب دیکھا تھا شہزادیوں نے پچھلے پہر
کہ اُس کے بعد مقدّر میں تاج و تخت نہ تھا

ذرا سے جبر سے میَں بھی تو ٹوٹ سکتی تھی
مری طرح سے طبیعت کا وہ بھی سخت نہ تھا

مرے لیے تو وہ خنجر بھی پھُول بن کے اُٹھا
زباں سخت تھی، لہجہ کبھی کرخت نہ تھا

اندھیری راتوں کے تنہا مسافروں کے لیے
دِیا جلاتا ہُوا کوئی ساز و رخت نہ تھا

گئے وہ دن کہ مجھی تک تھا میرا دُکھ محدُود
خبر کے جیسا یہ افسانہ لخت لخت نہ تھا

زُود پشیمان

گہری بھُوری آنکھوں والا اِک شہزادہ
دُور دیس سے
چمکیلے مُشکی گھوڑے پر ہَوا سے باتیں کرتا
جگر جگر کرتی تلوار سے جنگل کاٹتا آیا
دروازوں سے لپٹی بیلیں پرے ہٹاتا
جنگل کی بانہوں میں جکڑے محل کے ہاتھ چھُڑاتا
جب اندر آیا تو دیکھا
شہزادی کے جسم کی ساری سوئیاں زنگ آلُودہ تھیں
رستہ دیکھنے والی آنکھیں
سارے شکوے بھُلا چکی تھیں !

تسلّی

اب جبکہ مَیں اپنے آپ پہ
شہرِ وفا کا ہر دروازہ
اپنے ہاتھوں بند کر آئی،
اور ان میں ہر اِک کی چابی
سبز آنکھوں والے نسیان کے سرد سمندر میں پھینک آئی ہُوں
ڈرا ڈرا سا یہ احساس بھی
کتنی ٹھنڈک دیتا ہے
زنداں کی اُونچی دیوار سے دُور

پُرانے شہر کی اِک چھوٹی سی گلی میں
ایک دریچہ
میرے نام پہ کھُلا رہے گا!

مَر بھی جاؤں تو کہاں لوگ بُھلا ہی دیں گے
لفظ میرے، مرے ہونے کی گواہی دیں گے

لوگ تھرّا گئے جس وقت منادی آئی
آج پیغام نیا ظلِّ الٰہی دیں گے

جھونکے کچھ ایسے تھپکتے ہیں گلوں کے رُخسار
جیسے اس بار تو پت جھڑ سے بچا ہی دیں گے

— ق —

ہم وہ شب زاد کہ سُورج کی عنایات میں بھی
اپنے بچّوں کو فقط کور نگاہی دیں گے

آستیں سانپوں کی پہنیں گے گلے میں مالا
اہلِ کُوفہ کو نئی شہر پناہی دیں گے

شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے
تحفتاً پھر انھیں مقتُول سپاہی دیں گے

تمام لوگ اکیلے تھے، راہبر ہی نہ تھا
بچھڑنے والوں میں اِک میرا ہم سفر ہی نہ تھا

برہنہ شاخوں کا جنگل گڑا تھا آنکھوں میں
وہ رات تھی کہ کہیں چاند کا گزر ہی نہ تھا

تمھارے شہر کی ہر چھاؤں مہرباں تھی مگر
جہاں پہ دُھوپ کڑی تھی وہاں شجر ہی نہ تھا

سمیٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبُو
ہَوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہُنر ہی نہ تھا

مَیں اتنے سانپوں کو رستے میں دیکھ آئی تھی
کہ تیرے شہر میں پہنچی تو کوئی ڈر ہی نہ تھا

کہاں سے آتی کِرن زندگی کے زنداں میں
وہ گھر ملا تھا مجھے جس میں کوئی دَر ہی نہ تھا

بدن میں پھیل گیا سُرخ بیل کی مانند
وہ زخم سُوکھتا کیا، جس کا چارہ گر ہی نہ تھا

ہَوا کے لائے ہُوئے بیج پھر ہَوا کو گئے
کِھلے تھے پھُول کچھ ایسے کہ جن میں زر ہی نہ تھا

قدم تو ریت پہ ساحل نے بھی نہ رکھنے دیا
بدن کو جکڑے ہُوئے صرف اِک بھنور ہی نہ تھا

کسی کی کھوج میں پھر کھو گیا کون
گلی میں روتے روتے سو گیا کون

بڑی مُدّت سے تنہا تھے مرے دکھ
خُدایا، میرے آنسو رو گیا کون

جلا آئی تھی میں تو آستیں تک
لہُو سے میرا دامن دھو گیا کون

جدھر دیکھوں کھڑی ہے فصلِ گریہ
مرے شہروں میں آنسو بو گیا کون

ابھی تک بھائیوں میں دُشمنی تھی
یہ ماں کے خُوں کا پیاسا ہو گیا کون

تراش کر مرے بازُو اُڑان چھوڑ گیا
ہَوا کے پاس برہنہ کمان چھوڑ گیا

رفاقتوں کا مری، اُس کو دھیان کتنا تھا
زمین لے لی مگر آسمان چھوڑ گیا

عجیب شخص تھا، بارش کا رنگ دیکھ کے بھی
کُھلے دریچے پہ اِک پھُول دان چھوڑ گیا

جو بادلوں سے بھی مُجھ کو چھپائے رکھتا تھا
بڑھی ہے دُھوپ تو بے سائبان چھوڑ گیا

نکل گیا کہیں اَن دیکھے پانیوں کی طرف
زمیں کے نام کھُلا بادبان چھوڑ گیا

عقاب کو تھی غرض فاختہ پکڑنے سے
جو گِر گئی تو یُونہی نیم جان چھوڑ گیا

نجانے کون سا آسیب دل میں بستا ہے
کہ جو بھی ٹھہرا وہ آخر مکان چھوڑ گیا

عقب میں گہرا سمندر ہے، سامنے جنگل
کِس انتہا پہ مرا مہربان چھوڑ گیا

شگُون

سات سُہاگنیں اور میری پیشانی !
صندل کی تحریر
بھلا پتھّر کے لِکھے کو کیا دھوئے گی
بس اتنا ہے
جذبے کی پُوری نیکی سے
سب نے اپنے اپنے خُدا کا اِسم مجھے دے ڈالا ہے
اور یہ سُننے میں آیا ہے
شام ڈھلے جنگل کے سفر میں
اِسم بہت کام آتے ہیں !

.... ہوا رہوار تھی میرا

ہَوا کی سرسراہٹ سُورۂ اخلاص کی آیت کُشا تھی
نصف شب کی نیم خوابیدہ زمیں
گہرے اندھیروں کا تنفّس
اپنی سانسوں سے اُلجھتے دیکھ کر شرمائی جاتی تھی
لہُو کی گردشوں میں ایک نامعلُوم رقصِ بے صدا جاری تھا
کوئی جسم کے اندر
بڑی گہری مہارت سے، بہت آہستگی سے، اس ادا سے
پاؤں رکھتا تھا
کہ باہر کا طلسمِ خامشی پہلے کی صُورت دم بخود رہتا

مگر اندر
کھنکتے گھنگھروؤں کے آبشاروں میں سماعت پھُول کی پتّی کی صُورت
نقرئی دھاروں پہ کٹتی جا رہی تھی!
سپہرِ جسم میں تا حدِّ امکاں
چاند کا جادُو،
ستارے چُنتا جاتا تھا
رگوں میں چاندنی یوں بہہ رہی تھی،
جیسے ان گہرے گلابی اور ہلکے نیلے رستوں پر
بہت پہلے،
کسی بے حد پُرانے اور پیارے دوست سے ملتی رہی ہو!
سنہرا رنگ اِک سیلاب بن کر
سبز دیواروں، رو پہلے طاقچوں، ہلکے بنفشی پھُول دانوں،
کاسنی پردوں سے ہو کر،
مُشک افشاں زُلفِ شب اور سُرخ چادر سے گزر کر،

حجلۂ جاں میں اُترتا جا رہا تھا
د نورِ پروردہ بصارت روشنی کے نام پر کجلائی جاتی تھی
مگر پھر چاند سے نظریں ہٹانا کتنا مشکل تھا!)
گزرتی رات کے ہونٹوں پہ کوئی اِسم تھا
جو ذات کے شہرِ صد آئینہ کے اِک اِک در پہ اپنے ہاتھ رکھتا
جا رہا تھا

اور ہر در کھُلتا جاتا تھا!
مرے آبا کی رُوحوں سے پُرانی
لوک قصّوں، دیو مالائی فسانوں سے بھی پہلے کی کہانی
میرے تن سے اپنا منظر لینے آئی تھی
امانت لے کے اپنی
میری شبنم رنگ پیشانی کو جب وہ چُومنے آئی
تو اُس کے لمس کا افسوں عجب تھا!
مرا ننھّا سا پیکر

اپنی وسعت میں
اُفق سے تا اُفق
ہفت آسماں تک پھیلا جاتا تھا!

ہوا رہوار تھی میرا
دھنک تھامے ہُوئے راسیں
بدن میرا ستارہ تھا!

قدموں میں مرے جُھکی ہُوئی رات
تاروں کی طرح بِچھی ہوئی رات

گِرتی ہے بدن پہ قطرہ قطرہ
خوشبُو سے کشید کی ہُوئی رات

آنکھوں پہ ستارے چُن رہی ہے
آنگن میں مرے کِھلی ہُوئی رات

ماتھے پہ نئی رفاقتوں کے
افشاں کی طرح چُنی ہُوئی رات

خوابوں کی سجل ہتھیلیوں پر
مہندی کی طرح رچی ہُوئی رات

آہٹ پہ کسی کی کسمسائی
دُلہن کی طرح سجی ہُوئی رات

تا عُمر نہ ٹوٹنے دے نشّہ
ساقی سے مرے مِلی ہُوئی رات

چھُوتی ہوئی ایک ایک تارا
آکاش پہ تیرتی ہُوئی رات

حل ہونے لگی لہُو میں میرے
سانسوں میں ترے گھُلی ہُوئی رات

شبنم سے گلاب پوُچھتے ہیں
اب تک تھی کہاں چھُپی ہُوئی رات

اِک پَل کو جھپک سکی نہ پلکیں
آنکھوں میں رہی رُکی ہُوئی رات

کیا چین کی نیند سو رہی ہے
اِک عمر سے جاگتی ہُوئی رات

ہے چُور تھکن سے لیکن اب تک
شاداب ہے ٹُوٹتی ہُوئی رات

اِک لمحہ سخن پہ ایسا آیا
چُپ ہو گئی بولتی ہُوئی رات

سُندر، کومل سپنوں کی بارات گزر گئی جاناں
دُھوپ آنکھوں تک آ پہنچی ہے رات گزر گئی جاناں

بھور سمے تک جس نے ہمیں باہم اُلجھائے رکھا
وہ البیلی ریشم ایسی بات گزر گئی جاناں

سدا کی دیکھی رات ہمیں اس بار ملی تو چُپکے سے
خالی ہات پہ رکھ کے کیا سوغات گزر گئی جاناں

کس کونپل کی آس میں اب تک ویسے ہی سرسبز ہو تم
اب تو دُھوپ کا موسم ہے برسات گزر گئی جاناں

لوگ نجانے کن راتوں کی مُرادیں مانگا کرتے ہیں
اپنی رات تو وہ جو تیرے سات گزر گئی جاناں

اب تو فقط صیّاد کی دلداری کا بہانہ ہے ورنہ
ہم کو دام میں لانے والی گھات گزر گئی جاناں

آنکھوں میں تھکن، دھنک بدن پر
جیسے شبِ اوّلیں دُلہن پر

دستک ہے ہوائے شب کی تن پر
کُھلتا ہے نیا دریچہ فن پر

رنگوں کی جمیل بارشوں میں
اُتری ہے بہار پھول بَن پر

تھامے ہُوئے ہاتھ روشنی کا
رکھ آئی قدم زمیں گگن پر

گزُرا تھا کوئی شریر جھونکا
سلوٹ ہے قبائے یاسمن پر

شبنم کے لبوں پہ ناچتی ہے
چھایا ہے عجب نشہ کرن پر

کھُلتی نہیں برگ و گُل کی آنکھیں
جادُو کوئی کر گیا چمن پر

خاموشی کلام کر رہی ہے
جذبات کی مُہر ہے سُخن پر

وصال

خُمارِ لذّت سے ایک پَل کو
جو آنکھیں چونکیں
تو نیم خوابیدہ سرخوشی میں
غرُورِ تاراجگی نے سوچا
خُدائے بَرتر کے قہر سے
آدمؑ اور حوّاؑ
بہشت سے جب بھی نکلے ہوں گے
سپُردگی کی اسی حسیں انتہا پہ ہوں گے
اسی طرح
ہم بدن اور ہم خواب و ہم تمنّا!

سپُردگی

زمیں اپنے قدیم محور کے گرد رقصاں ہے
اور فضا میں
کسی پُراسرار سرخوشی کا سرُور اس طرح بہہ رہا ہے
کہ جیسے بادِ شمال نے جھوم کر ہرے موسموں کے تن میں
کہیں رگِ تاک کھول دی ہو
اور اب محبّت کی اوک سے زندگی کو خوشبُو پلا رہی ہے!
نظر سے اوجھل کوئی خوشی ہے
کہ جسم کی پور پور کو چھُو رہی ہے آکر
لہُو کی نیلی صداقتوں میں اُترنے والی گلابی لذّت
مرا بدن چوُمنے لگی ہے

بیک زماں کوئی زندگی دے کے
جسم سے جان کھینچتا ہے
یہ جاں سے جانے کا اور مسیحائی کا تصادم
عناصرِ زندگی کا بے حد قدیم سنگم
وجُود کے سرمدی دُھندلکے میں
آب و آتش بہم ہُوئے ہیں
ہوَا نے مٹّی کے سامنے سر جُھکا دیا ہے!

دُودھ، شہد اور شبنم

وہی بدن ہے
کہ ابرِ نیساں سے قبل
بے برگ و بے ثمر تھا
بہار کی بارشوں میں ایسا نکھر گیا ہے
کہ زندگی سبز روشنی میں نہا گئی ہے
وجُود کی بے ہُنر جڑوں تک
نمو کی شبنم اُتر چکی ہے
جلی ہُوئی شاخ کی نئی کونپلوں میں پھر دُودھ بھر رہا ہے
ہزاروں خوش رنگ تتلیوں کا حسین جُھرمٹ
شجر کے تن پر جُھکا ہُوا ہے
محبّتیں اعتبار پا کر
بدن کے سب ذائقوں کو امرت بنا رہی ہیں!

بچ رہا تھا اک پرندہ ڈال پر ہنستا ہُوا
جال وہ پھینکے ہَوا نے وہ بھی پَر بستہ ہُوا

دے کے مجھ کو اذن گہرے پانیوں کی سیر کا
خود روانہ ہے وہ میری رسّیاں کستا ہُوا

شہر کی ہر رہگزر پر برف خیمہ زن ہُوئی
بند اگلے چاند تک اب دُھوپ کا رستہ ہُوا

جو ہَوا آئی، مرے چہرے پہ پاؤں رکھ گئی
اُونچی شاخوں کا شگوفہ برگِ نو رستہ ہُوا

ریت پر لکھّا گیا یا سطحِ موجِ آب پر
نام جو اُس آنکھ کی وحشت سے وابستہ ہُوا

بختِ رُسوائی کہ کوئی اپنی نظروں میں گرا
اور کوئی مصر کے بازار میں سستا ہُوا

چاند کا پیغام دُھندلا تھا نہ چہرہ حرف کا
شہر کے سارے دریچوں پر ہے پردہ برف کا

یہ ہَوا کی سرد مہری تھی کہ میرے دل کا خوف
جم گیا ہے ہونٹ پر آکر تنفّس حرف کا

دیکھ کر قاتل کے بچّے در گزر کرتا قصاص
کون تھا مقتُول کے پیاروں میں اتنے ظرف کا

ایک وہ موسم کہ مجھ پر مسکراہٹ جبر تھی
اور اب موقع نہیں ملتا ہنسی کے صرف کا

ہاتھ بھی جُھلسے، بدن بھی بے اماں ہو کر رہا
چھوڑ کر مٹّی بنایا، جب گھروندہ برف کا

ہنی مُون

سُرخ انگور سے چھنی ہُوئی یہ سرد ہَوا
جس کو قطرہ قطرہ پی کر
میرے تن کی پیاسی شاخ کے سارے پیلے پھُول گلابی
ہونے لگے ہیں

سوچ کے پتھّر پہ ایسی ہریالی اُگ آئی ہے
جیسے ان کا اور بارش کا بڑا پُرانا ساتھ رہا ہو
ہریالی کے سبز نشے میں ڈُوبی خوشبُو
میری آنکھیں چُوم رہی ہے

خوشبُو کے بوسوں سے بوجھل میری پلکیں
ایسے بند ہُوئی جاتی ہیں
جیسے ساری دُنیا اِک گہرا نیلا سیّال ہے
جو پاتال سے مُجھ کو اپنی جانب کھینچ رہا ہے
اور مَیں تن کے پُورے سُکھ سے
اس پاتال کی پہنائی میں
دھیرے دھیرے ڈُوب رہی ہُوں !

کلام

(۱)

ہَوا میں زمرّد گھُلا ہے!
(شجر کا بدن ایک لمسِ گریزاں میں شاداب کر دے)
کوئی لاتعلّق سا جھونکا
کسی سنگ ریزے کے رُخسار کو تھپتھپا دے
تو وہ دیکھتے دیکھتے
سبز خط ہو کے یوں جی اُٹھے گا
کہ بنجر پہاڑوں کے چہرے گلابوں کے سہرے میں چھپ جائیں گے
کاسنی پتھرّوں سے پرے

نیلے چشموں کی آواز سے بال دھوتی ہُوئی شوخ چنچل ہَوا
زندگی کی سُہاگن ہنسی
پیڑ، آنگن، دریچے
جسے چُوم لے
رنگ سے بیاہ دے!

کالام
(۲)

برف کی رُت اور تن پر ایک بوسیدہ قبا
جس سے جگہ جگہ موسم کی نیلی شدّت جھانک رہی ہے
ہر جھونکے پر ہلتے ہُوئے لکڑی کے مکاں
جن پر بارش پنجے گاڑے بیٹھی ہے
سرد ہوا سے سارے گھر زخمی ہیں
لیکن —— سب کی چھتوں پر
نیلے پیلے سبز گلابی جھنڈے ایسے لہراتے ہیں
جیسے وادی کے سب بچّے ریشم پہنے گھوم رہے ہوں!

نیلم — تیرے کتنے رنگ

پتھّر کاٹ کے اپنا رستہ ڈھونڈنے والے نیلم!
تیری نرم آواز کے سائے سائے سپنے بُنتی
تیرے کناروں پر سے تیری سبز کمائی چُنتی
شہر سے آئی لڑکی،
تجھ کو بہتے، تجھ کو ہنستے، تجھ کو موج اُڑاتے دیکھے
من ہی من میں سوچے
پَو پھٹنے سے لے کر چاند کے ڈھل جانے تک
تیرے سارے رنگ عجب ہیں

کبھی تو بچّے کی آنکھوں میں جمی ہُوئی حیرت کی صُورت نیلا
کبھی کسی کی پہلی چاہت جیسا اُجلا
کبھی شہر کو جانے والے رستے کی صُورت کالا،
کبھی ہرن کی آنکھوں جیسا من موہن بھولا بھالا،

بادل کے مٹیالے دُکھ کا سارا بھُورا پن اپنائے
چاند کے سینے کے ہر داغ کو اپنے اُجلے من میں چھپائے
سبز کبھی اُمید کی صُورت
زرد فراق کے جیسا
چرواہی کی اوڑھنی جیسی کبھی کاسنی لہریں
سُرخ پہاڑ تک آتے آتے وہی جامنی لہریں
پھُولوں کے جھُرمٹ تک پہنچے جونہی سادہ پانی
کہیں سُنہرا کہیں چمپئی کہیں چمکتا دھانی
کھُلے روپہلے آسمان تک آ کر پھر وہی نیلا
وہی ازل اور ابد کا رنگ جو کبھی پڑا نہیں پھیکا
لہر کے ساتھ سفر کرتے مری آنکھیں دُکھنے آئیں
تیرے رنگ نہ ٹھہرے،

تیری موجیں نہ رُکنے پائیں
نیلم —— تُو بھی عجب مسافر
صدیوں سے اوروں کے لیے بہتا جائے
سب کے دُکھ سُکھ آئینہ کرتا جائے!

شرارت

جھاگ اُڑاتا چشمہ
میرے بال بھگو کر
دُور کہیں جا نکلا ہے
لیکن اُس کی شوخی اب تک
میری مانگ سے موتی بن کر
قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہے!

گیلے بالوں سے چھنتا سُورج

شوخ کِرن نے
گیلے ریشم بالوں کو جس لمحہ چھُوا
بے ساختہ ہنس دی
پلکوں تک آتے آتے
سُورج کی ہنسی بھی
گوری کی مُسکان کی صُورت
سات رنگ میں بھیگ چکی تھی!

بج اُٹھے ہوا کے دَف وجد میں کلی آئی
زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی

میں بھی کتنی بھولی تھی ایک لُطفِ مبہم پر
رقص گہ میں گرگابی چھوڑ کر چلی آئی

چشم و دل کے سب آنسو اس ہوا میں کھِل اُٹھے
شاخسارِ مژگاں پر رُت گُلاب کی آئی

شہر کے شگوفوں کے نیم رس سے اُکتا کر
تازگی سے ملنے کو بن میں تیتری آئی

اس سے قبل بھی سائے کب قریب آئے تھے
اس نئے سفر میں بھی کام دُھوپ ہی آئی

تُو نے کبھی سوچا

گِلہ کم گوئی کا مجھ سے بجا ہے
لیکن اے جانِ سُخن !
تُو نے کبھی سوچا
کہ تیری سمت جب میں آنکھ بھر کر دیکھتی ہُوں تو
مری ہلکی سُنہری جلد کے نیچے
اچانک
اتنے ڈھیروں ننھّے ننھّے سے دِیے کیوں جلنے لگتے ہیں ؟

اولمپکس

مُقدّس رسم ہے
سو احتراماً اہلِ یُوناں
فصلِ گُل میں
سُرخ سُورج کی کِرن سے اپنی مشعل کو جلا کر
کھیل کے تہوار کا آغاز کرتے ہیں
یہ منظر ساری دُنیا دیکھتی ہے
مگر یہ بات کس کے عِلم ہوگی
کہ اب کے سال
پیلے ایشیا کے ایک بہت چھوٹے سے قصبے کے
بہت ننھّے سے آنگن میں

جو دو شمعیں جلی ہیں
ان کی لَو کو چاند نے روشن کیا ہے
اور یہ منظر صرف دو آنکھوں نے دیکھا ہے
مگر یہ کھیل
(شاید زندگی کا سب سے پیارا کھیل)
ان مقدونیوں کے کھیل سے بے حد پُرانا ہے!

بُلاوا

میں نے ساری عمر
کسی مندر میں قدم نہیں رکھا
لیکن جب سے
تیری دُعا میں
میرا نام شریک ہُوا ہے
ترے ہونٹوں کی جنبش پر
میرے اندر کی داسی کے اُجلے تن میں
گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں!

محبّت آشنا

میں تجھ سے مل کے جونہی باہر آئی
مارچ کی تیکھی ہوَا
بچپن کے ساتھی کی طرح سے
رنگ کی پچکاریاں تھامے کھڑی تھی
قبل اس کے
میں ہوَا کی مُسکراہٹ کو سمجھ پاتی
مری پیاری سہیلی
رنگ میں مجھ کو بھگوتی، کِھلکھلاتی، ناچتی

پل بھر میں اوجھل ہو چکی تھی
اور پل بھر میں ہی
میرے جاگتے تن پر
دھنک کی اتنی قوسیں بن چکی تھیں
آج جتنی بار مجھ کو دیکھ کر تُو مُسکرایا تھا!

اِسم

بہت پیار سے
بعد مُدّت کے
جب سے کسی شخص نے چاند کہہ کر بُلایا ہے
تب سے
اندھیروں کی خُوگر نگاہوں کو
ہر روشنی اچھی لگنے لگی ہے!

جمالِ ہم نشیں

ترے آئینۂ فن میں
سراپا دیکھ کر اپنا
بہت حیران ہُوں
اور بار ہا پلکیں جھپکتی ہُوں کہ یہ مَیں ہُوں
(کہ کوئی اور لڑکی ہے!)
مری آنکھوں میں پہلے بھی شرارت تھی
مگر اب تو ستارے کِھلکھلاتے ہیں!
مرے لب اِس سے پہلے بھی تبسّم آشنا تھے

لیکن اب تو بے ضرورت مُسکراتے ہیں
غرُور ایسا کہاں کا آگیا دھیمے مزاجوں میں
کہ دن میں بھی اُڑی پھرتی ہُوں خوابوں کی ہَواؤں میں
مرے لہجے میں ایسی نرم فامی کب سے در آئی
کہ جس سے بات کرتی ہُوں
سماعت پھُول چُنتی ہے
ہنسی میں اس کھنک کی گُونج ہے
جس سے محبّت گیت. بُنتی ہے
اور ان سب سے سوا
دل کی گدازی،
جو مجھ کم ظرف کو شائستۂ ضبطِ الم کر دے
کہ دشمن کی بھی اُنگلی تو میری آنکھ نم کر دے
سِکھلائے چشم پوشی
دوست کا پردہ رکھے

بلکہ

خلوصِ ہم رہاں کو شک کی آنکھوں سے ہمیشہ دیکھنا ہی
ترک کروا دے
لہو کے اعترافِ عشق پر ایمان لانے کی بصیرت دے
مجھے گوتم کے ہر اُپدیش، عیسیٰ کے ہر اِک سرمن کا بین السطر
سمجھا دے!
میں اُس کی خوش گماں آنکھوں سے
دُنیا دیکھتی ہوں
مُسکرا کر سوچتی ہوں،
زمیں یک لخت کتنی خوبصورت ہو گئی ہے!

شہر کو تیری جستجو ہے بہت
ان دنوں ہم پہ گفتگو ہے بہت

جب سے پرواز کے شریک ملے
گھر بنانے کی آرزو ہے بہت

درد رہ رہ کے سر اُٹھاتا ہے
کبھو کم ہو گیا، کبھو ہے بہت

کچھ تو وہ یاد بھی بہت آیا
کچھ ان آنکھوں میں بھی لہو ہے بہت

پینے والی نگاہ ہے درکار
آنکھ کو چاند کا سبو ہے بہت

دُھوپ سات رنگوں میں پھیلتی ہے آنکھوں پر
برف جب پگھلتی ہے اس کی نرم پلکوں پر

پھر بہار کے ساتھی آ گئے ٹھکانوں پر
سُرخ سُرخ گھر نکلے سبز سبز شاخوں پر

جسم و جاں سے اُترے گی گرد پچھلے موسم کی
دھو رہی ہیں سب چڑیاں اپنے پنکھ چشموں پر

ساری رات سوتے میں مُسکرا رہا تھا وہ
جیسے کوئی سپنا سا کانپتا تھا ہونٹوں پر

تتلیاں پکڑنے میں دُور تک نکل جانا
کتنا اچھا لگتا ہے پھُول جیسے بچّوں پر

لہر لہر کرنوں کو چھیڑ کر گزرتی ہے
چاندنی اُترتی ہے جب شریر جھرنوں پر

بس اے بہار کے سُورج! بڑھا یہ قہر کا رنگ
جلا گئی ہے تری دُھوپ میرے شہر کا رنگ

شجر کو سبز قبا دیکھ کر یہ اُلجھن ہے
کہاں پہ رنگِ نمو ہے کہاں پہ زہر کا رنگ

کنارِ جوئے رواں جب سے قتل گاہ بنی!
ہجوم اُمڈنے لگا دیکھنے کو نہر کا رنگ

ابھی تو مَیں نے سمندر میں ناؤ ڈالی تھی
یہ کیا ہُوا کہ بدلنے لگا ہے لہر کا رنگ

یہ احتجاج بجا ہے کہ تیز تھی بارش
یہ ماننا ہے کہ کچّا تھا اپنے شہر کا رنگ

گِلہ ہی کیا ہے اگر وہ بھی سبز چشم ہُوا
طبیعتوں پہ تو چڑھتا رہا ہے دہر کا رنگ

وہ آج بھی مجھے سوتے میں ڈسنے آئے گا
وہ جانتا ہے کہ کِھلتا ہے مجھ پہ زہر کا رنگ

اُترنے پائے گا قوسِ قزح کا تھام کے ہاتھ
سوادِ حرف میں کب عشقِ بے سپہر کا رنگ

امیرِ شہر سے سائل بڑا ہے
بہت نادار لیکن دل بڑا ہے

لہُو جمنے سے پہلے خوں بہا دے
یہاں انصاف سے قاتل بڑا ہے

چٹانوں میں گھِرا ہے اور چُپ ہے
سمندر سے کہیں ساحل بڑا ہے

کسی بستی میں ہوگی سچ کی حُرمت
ہمارے شہر میں باطل بڑا ہے

جو ظلِّ اللہ پر ایمان لائے
وہی داناؤں میں عاقل بڑا ہے

اُسے کھو کر بہائے درد پائی
زیاں چھوٹا تھا اور حاصل بڑا ہے

پرو دیے مرے آنسو ہوا نے شاخوں میں
بھرم بہار کا باقی رہے نگاہوں میں

صبا تو کیا کہ مجھے دھوپ تک جگا نہ سکی
کہاں کی نیند اُتر آئی ہے ان آنکھوں میں

کچھ اتنی تیز ہے سُرخی کہ دل دھڑکتا ہے
کچھ اور رنگ پسِ رنگ ہے گلابوں میں

سپردگی کا نشہ ٹوٹنے نہیں پاتا
انا سمائی ہوئی ہے وفا کی بانہوں میں

بدن پہ گرتی چلی جا رہی ہے خواب سی برف
خنک سپیدی گھُلی جا رہی ہے سانسوں میں

سیف الملوک[1] سے!

شہزادے!
تُو خوش قسمت تھا ——!
جس خواب کی اُنگلی تھامے ——
تُو رستم و کَے کی مٹی سے
سرکش دریاؤں تنگ نکیلی گھاٹیوں، سخت چٹانوں سے
ہوتا ہُوا
ساٹھ برس میں ——
مغرور ہمالہ کی اس پتھر چوٹی تک آ پہنچا تھا
اس خواب نے خود برسوں تیرا رستہ دیکھا

---

[1] وادیٔ کاغان کی ایک لوک روایت کا کردار

اور تیری سبز پری نے ——
پھر تیری پذیرائی اس شان سے کی
کہ اپنی مٹّی، اپنا پانی ——
اور اپنی ہوا اور اپنی آگ ——
سب تیرے حوالے کر دی ——
ترے پاؤں کے سب چھالے شبنم انجام ہُوئے
ترا ایک جنم —— اور ایک سفر
منزل سے آ کر گلے ملے
مرے سارے جنم اور سارے سفر
منزل سے پہلے اُجڑ گئے
مرے پاؤں ہمیشہ اُکھڑ گئے!

نِک نیم[۱]

تم مجھ کو گڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو ——!
کھیلنے والے سب ہاتھوں کو میں گڑیا ہی لگتی ہُوں
جو پہنا دو، مجھ پہ سجے گا
میرا کوئی رنگ نہیں
جس بچّے کے ہاتھ تھما دو
میری کسی سے جنگ نہیں

---
۱ NICK NAME

سوچتی جاگتی آنکھیں میری
جب چاہے بینائی لے لو
کُوک بھرو اور باتیں سُن لو
یا میری گویائی لے لو
مانگ بھرو، سیندُور لگاؤ
پیار کرو، آنکھوں میں بساؤ
اور پھر جب دل بھر جائے تو
دل سے اُٹھا کے طاق پہ رکھ دو
تم مجھ کو گُڑیا کہتے ہو
ٹھیک ہی کہتے ہو !

کس شہر میں لائی خوش کلامی
دل یثربی و رفیق شامی

اِک عُمر سے زندگی کا معمُول
تنہائی ہے اور خُود کلامی

دریا بھی جو میری رہگذر ہو
تقدیرِ سفر ہے تشنہ کامی

کچھ رستے ہیں عشق کے، جہاں پر
آتی نہیں کام تیز گامی

سب فیض اُسی شفق نظر کا
کیا چیز ہے میری لالہ فامی

جو اپنے کمال کی جزا لے
کس کام کی ایسی نیک نامی

سب عشق کریں گے اور سچّا
ہے اپنے قبیلے میں یہ خامی

جس جال کی رسّیاں ہوں ڈھیلی
کیا سمجھے گا میری زیر دامی

ننھّا سا پرند شاخِ گُل پر
ہے ابرِ بہار کا پیامی

رنگوں کو تو چُن دیا نظر میں
خوشبُو کی زمام کس نے تھامی

جذبات ہی کُند ہیں تو بے کار
تلوار کی لاکھ بے نیامی!

آنکھوں سے رواں ہے جُوئے خُوں پر
پہلی سی نہیں سُبک خرامی

یہ رسم تو میر سے چلی ہے
دل والوں کو درد کی سلامی

ہم بے ہُنروں کی زیست، پَل بھر
اقبال کی زندگی دوامی!

کیکر تے انگور چڑھایا

وہ وقت جو تجھ بِن بیت گیا
اس وقت کا کون حساب کرے،
اِک دُھوپ چھاؤں کا موسم تھا،
کبھی زخمِ جگر، کبھی مرہم تھا
یُوں جان کہ وہ گزری ہُوئی عمر
اِک لمبی کالی رات تھی
جس کے ماتھے پر
جھوٹے تاروں کی افشاں تھی

(اور اس افشاں کو مَیں نے اپنی مانگ میں بھرنا چاہا تھا!)
اک لمبی کالی رات کہ جس کے پہلے پہر کی آنکھوں میں
اَدھ کُھلے دریچے اور ان کی بے خوابی تھی،
اور پچھلے پہر کی سانسوں میں
پھر کبھی نہ آنے والوں کے قدموں کی آہٹ
واہمہ بن کر گُونجتی تھی،
(ہر واہمہ تب کس درجہ یقین سا لگتا تھا)
مَیں ایسی شاخ کہ جو اپنی کچّی کلیاں
بارش سے قبل جلا بیٹھی
جب پھُول آنے کے دن آئے
بادل کا پیار گنوا بیٹھی،
کیسی کیسی بے معنی باتوں میں شامیں برباد ہُوئیں
کیسے بے مصرف کاموں میں اُجلی راتیں برباد ہُوئیں
کس درجہ منافق لوگوں میں دل سچّی بات سُناتا رہا

وہ جن کے قلوب پہ مہریں تھیں انھیں روشنیاں دکھلاتا رہا
کیسے کیسے پیارے جذبے
کن ناقدروں کو دان کیے
کیسی بار آور رُت نے بے زر موسم سے پیمان کیے
کن کم ہمت شہزادوں کے وعدوں پہ بھروسا کر کے
اپنے نوخفتہ جسم میں سُوئیاں گڑوالیں
کن آسیبوں کے کہنے میں
آبادیاں شہرِ جاں کی تمام اُجڑوالیں

کیا کیا دُکھ دل نے پائے
ننھّی سی خوشی کے بدلے
ہاں کون سے زخم نہ کھائے
تھوڑی سی ہنسی کے بدلے

زخموں کا کون شمار کرے
یادوں کا کیسے حصار کرے
اور جینا پھر سے عذاب کرے
اُس وقت کا کون حساب کرے
وہ وقت — جو تجھ بن بیت گیا!

شام آئی، تری یادوں کے ستارے نکلے
رنگ ہی غم کے نہیں، نقش بھی پیارے نکلے

ایک موہوم تمنّا کے سہارے نکلے
چاند کے ساتھ ترے ہجر کے مارے نکلے

کوئی موسم ہو مگر شانِ خم و پیچ وہی
رات کی طرح کوئی زُلف سنوارے نکلے

رقص جن کا ہمیں ساحل سے بہا لایا تھا
وہ بھنور آنکھ تک آئے تو کنارے نکلے

وہ تو جاں لے کے بھی ویسا ہی سُبک نام رہا
عشق کے باب میں سب جُرم ہمارے نکلے

عشق دریا ہے، جو تیرے وہ تہی دست رہے
وہ جو ڈُوبے تھے، کسی اور کنارے نکلے

دُھوپ کی رُت میں کوئی چھاؤں اُگاتا کیسے
شاخ پھُوٹی تھی کہ ہمسایوں میں آرے نکلے

ایک سفر

اُونچے نیچے پُراسرار پہاڑی رستے
رستوں کے نیچے بَل کھاتا دریا
دریا اور پہاڑ سے ہٹتا بچتا
طُوفانی بارش میں
ہَوا سے باتیں کرتا
میرا مُشکی گھوڑا
اور تری چاہت کی راس !

ایک کوہستانی المیہ

بادل اتنے پاس ——
ہاتھ بڑھا کر چھُولیں !
پانی اتنی دُور ——
ہاتھ کٹا کر بھی کچھ ہاتھ نہ آئے !

اِسلام آباد — علی الصّبح

ہلکی سُرخ پہاڑی پر
دُودھیا پھُولوں کی چادر
کچھ ایسے بچھی تھی
جیسے پہلی رات کے بعد
دُلہن کے آنچل سے جھڑنے والے ستارے
صُبح کی سیج پہ کِھلے ہُوئے ہوں!

جیون ساتھی سے!

دُھوپ میں بارش ہوتے دیکھ کے
حیرت کرنے والے!
شاید تُونے میری ہنسی کو
چھُو کر
کبھی نہیں دیکھا!

نئی آنکھ کا پُرانا خواب

آتش دان کے پاس
گلابی حِدّت کے ہالے میں سمٹ کر
تجھ سے باتیں کرتے ہوئے
کبھی کبھی تو ایسا لگا ہے
جیسے اوس میں بھیگی گھاس پہ
اس کے بازو تھامے ہُوئے
مَیں پھر نیند میں چلنے لگی ہُوں !

محرُومی

ننھّے سواتی بچّے کے کشکول میں
صُبح سے شام تلک
نیلی آنکھوں، بھُورے بالوں، دھن وانوں کی بدولت
اُجلی ہنسی اور چمکیلے آنسُو کے عکس کے بدلے
میلے سِکّے آج بھی دن بھر گرتے رہے
آج بھی کھوجتی رہی سماعت
کاسۂ دل میں کوئی کھنک !

گُونج

اونچے پہاڑوں میں گُم ہوتی پگڈنڈی پر
کھڑا ہُوا ننّھا چرواہا
بکری کے بچّے کو پھسلتے دیکھ کے
کچھ اس طرح ہنستا ہے
وادی کی ہر درز سے جھرنے پھُوٹ رہے ہیں !

خاکم بدہن

سرکار !
ہم تو آپ کے ایماں نثار تھے
ہر مقتلِ جفا میں لہُو کے شریک تھے
کم پوشئ قبا میں رفُو کے شریک تھے
دل آپ دُکھا ہے تو آنسُو اِدھر بہے
چوٹ آپ کو لگی تھی مگر نیل کب پڑے
اپنی ہی سمت کھنچا ہُوا تیر ہم بھی تھے
اپنے خلاف لی ہُوئی تعزیر ہم بھی تھے

لیکن یہ سُکھ بہت تھا کہ کچھ معتبر تو ہیں
منزل نہیں ہیں آپ کی گردِ سفر تو ہیں
یہ کیا کیا کہ گردِ سفر بھی نہ اُٹھ سکے
چشمِ خطا سے بارِ نظر بھی نہ اُٹھ سکے
اب تک تو شہرِ جاں پہ عذاب آئے تھے مگر
اب کے تو اعتبار کی دُنیا اُجڑ گئی
ماتھے پہ بل نہ آنے دیا تھا کبھی تو پھر
لہجے میں اتنی گہری شکن کیسے پڑ گئی؟

بدن کے موسمِ بے اختیاری میں

کوئی دن زندگی میں ایسا آئے
تو میرے دھیان کھو کر
رموزِ شہریاری بھول جائے
مَیں اس شدّت سے یاد آؤں
شکوہِ کج کلاہی بھول جائے
مرے بھی سارے رشتے۔ سارے ناطے
خود فراموشی بہالے جائے
کُل دُنیا سمٹ کر تیری باہوں میں سما جائے

بدن کے موسمِ بے اختیاری میں
کسی پَل ——
فصیلِ شہر سے باہر
حصارِ چادر و دستار کی حد سے نکل کر
ایک لمحے کو —— بس اک لمحے کو
ہم اپنے مقدّر آزما لیں ——
شبِ ممنوع سے اِک پَل چُرا لیں !

تاوان

گُلِ انار کی ہلکی گلُابی چھاؤں میں بیٹھ کے
کافی بنانا
مجھے بھی اچھا لگتا ہے
لیکن ایسا کرتے ہُوئے
میری جُھکی ہُوئی پلکیں
تجھ سے جو رنگ چھپاتی ہیں
وہ اس چھاؤں کے رنگ سے بڑھ کر گہرا ہے !

ہَوا چلے تو

ہَوا چلے تو
اپنی سمت بُلاتی ہے
پیڑ کے نرم گھنے پتّوں میں
اٹکی ہُوئی بارش کی ہنسی !

ساتھی

اکیلے گھر میں
شریر چڑیا کا گیت
چہرے اُگا رہا ہے !

نیرنگ

جابر حاکم کے دل جیسا
تنگ سیاہ پہاڑ
مظلُوموں کی آنکھوں جیسا
ہر پتھّر کا سینہ
ہَوا چلی اور جاگ اُٹھا
کوئی زخم پُرانا
ٹھیس لگی اور پھُوٹ بہا
گرم . روپہلا چشمہ!

چیڑ کے مغرُور پیڑ

چیڑ کے مغرُور پیڑ
جن کی آنکھیں
اپنی قامت کے نشے میں صرف اُوپر دیکھتی ہیں
اپنی گردن کے تناؤ کو کبھی تو کم کریں
اور نیچے دیکھیں
وہ گھنے بادل جو اُن کے پاؤں کو چھُو کر گزر جاتے ہیں
جن کو چُوم سکتے ہیں
وہ پودے
پیار کے اس والہانہ لمس سے کیسے نکھر آئے!

پیشی

شُہرتیں نیکیوں کی سزا ہیں
مری ذات بھی، ایک دن
واژگوں جام کی طرح
میخانۂ زندگی میں
تجسّس سے پیاسی نگاہوں کے آگے بکھر جائے گی
جس کا دل چاہے
جس ہاتھ سے
جس طرح سے چھُوئے
قطرے قطرے کو دینا پڑے گا
نشے کا حساب!

سجدہ

جسم کی چاہ میں
آتشِ لمس سے جب رگِ جاں چٹخنے لگے
اور من و تُو کے مابین
اک بال سے بڑھ کے باریک لمحہ بھی آخر بکھرنے لگے
اُس سمے
صرف میری نگاہوں کا دُکھ دیکھ کر
ہر طلب کی زباں کاٹ دینا
تمہاری بڑائی ہے
اور اس بڑائی کے آگے
مرے لب ابھی تک تمہارے نقوشِ قدم پر جھکے ہیں!

پا بہ گِل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون
دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

میرا سر حاضر ہے لیکن میرا منصف دیکھ لے
کر رہا ہے میری فردِ جُرم کو تحریر کون

آج دروازوں پہ دستک جانی پہچانی سی ہے
آج میرے نام لاتا ہے مری تعزیر کون

کوئی مقتل کو گیا تھا مدّتوں پہلے مگر
ہے درِ خیمہ پہ اب تک صورتِ تصویر کون

میری چادر تو چھنی تھی شام کی تنہائی میں
بے ردائی کو مری، پھر دے گیا تشہیر کون

سچ جہاں پابستہ، مُلزم کے کٹہرے میں ملے
اُس عدالت میں سُنے گا عدل کی تفسیر کون

نیند جب خوابوں سے پیاری ہو تو ایسے عہد میں
خواب دیکھے کون اور خوابوں کو دے تعبیر کون

ریت ابھی پچھلے مکانوں کی نہ واپس آئی تھی
پھر لبِ ساحل گھروندا کر گیا تعمیر کون

سارے رشتے ہجرتوں میں ساتھ دیتے ہیں تو پھر
شہر سے جاتے ہُوئے ہوتا ہے دامن گیر کون

دُشمنوں کے ساتھ میرے دوست بھی آزاد ہیں
دیکھنا ہے کھینچتا ہے مجھ پہ پہلا تیر کون

مشکل ہے کہ اب شہر میں نکلے کوئی گھر سے
دستار پہ بات آگئی ہوتی ہوئی سر سے

برسا بھی تو کس دشت کے بے فیض بدن پر
اک عمر مرے کھیت تھے جس ابر کو ترسے

اس بار جو ایندھن کے لیے کٹ کے گرا ہے
چڑیوں کو بڑا پیار تھا اُس بوڑھے شجر سے

محنت مری آندھی سے تو منسوب نہیں تھی
رہنا تھا کوئی ربط شجر کا بھی ثمر سے

خود اپنے سے ملنے کا تو یارا نہ تھا مجھ میں
مَیں بھیڑ میں گُم ہو گئی تنہائی کے ڈر سے

بے نام مُسافت ہی مقدّر ہے تو کیا غم
منزل کا تعیّن کبھی ہوتا ہے سفر سے

پتھرایا ہے دل یوں کہ کوئی اِسم پڑھا جائے
یہ شہر نکلتا نہیں جادُو کے اثر سے

نکلے ہیں تو رستے میں کہیں شام بھی ہوگی
سورج بھی مگر آئے گا اِس راہگزر سے

اسٹینوگرافر

چمکیلی صُبح سے پہلے
جب نیند بدن میں شہد کی صُورت گھُلتی ہو
اور صبا کے ہاتھوں گرہ ہر درد کی کھُلتی ہو
اُس وقتِ شفا
سب کچّے زخم بدن کے
سب پیاسے پسنے تن کے
بے قیمت جان کے اُٹھنا
اک ہار سی مان کے اُٹھنا

اور خود کو موسم کی بے مہر ہَوا کے حوالے کر دینا
دن بھر بے معنی ہندسوں
اور بے مقصد ناموں کو
بس خالی ذہن اور بے حس ہاتھ سے ٹائپ کرتے جانا
گاہے گاہے حسبِ موقع
گنجے سر والے باس کی میٹھی اور کڑوی باتیں سہنا
اور پتّھر کی مُورت کی طرح ہر لہجے پر چُپ رہنا
پھر شام گئے
جب چڑیاں تک اپنے گھر کی ہو جائیں
دفتر کی خُنک بھٹّی سے
جُھلسا ہُوا چہرہ لے کر
صدیوں کی تھکن سے دوہرے
جھکتے ہُوئے شانے تھامے
بھُوکی آنکھوں، جلتے فقروں، گھر تک چھوڑ آنے والی
شائستہ کاروں سے بچتی

ڈر ڈر کے قدم اُٹھاتی
اک اسٹینو گرافر
اپنے گھر لوٹ آتی ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار کو تھام کے شاید روز ہی کہتی ہے
مالک !
اک دن ایسا بھی آئے
مرے سر پر چھت پڑ جائے !

ورکنگ وومن

سب کہتے ہیں
کیسے غرور کی بات ہوئی ہے
مَیں اپنی ہریالی کو خود اپنے لہو سے سینچ رہی ہوں
میرے سارے پتّوں کی شادابی
میری اپنی نیک کمائی ہے
میرے ایک شگوفے پر بھی
کسی ہوا اور کسی بارش کا بال برابر قرض نہیں ہے
مَیں جب چاہوں کِھل سکتی ہوں

میرا سارا رُوپ، مری اپنی دریافت ہے
مَیں اب ہر موسم سے سر اُونچا کر کے مل سکتی ہُوں
ایک تناور پیڑ ہُوں اب مَیں
اور اپنی زرخیز نمو کے سارے امکانات کو بھی پہچان رہی ہُوں
لیکن میرے اندر کی یہ بہت پُرانی بیل
کبھی کبھی —— جب تیز ہَوا ہو
کسی بہت مضبُوط شجر کے تن سے لپٹنا چاہتی ہے!

— اپنی تنہائی مرے نام پہ آباد کرے
کون ہوگا جو مجھے اُس کی طرح یاد کرے

— دل عجب شہر کہ جس پر بھی کھُلا دَر اِس کا
وہ مسافر اسے ہر سمت سے برباد کرے

— اپنے قاتل کی ذہانت سے پریشان ہوں میں
روز اک موت نئے طرز کی ایجاد کرے

اتنا حیراں ہو مری بے طلبی کے آگے
وا قفس میں کوئی در خود مرا صیّاد کرے

سلبِ بینائی کے احکام ملے ہیں جو کبھی
روشنی چھُونے کی خواہش کوئی شب زاد کرے

سوچ رکھنا بھی جرائم میں ہے شامل اب تو
وہی معصوم ہے ہر بات پہ جو صاد کرے

جب لہُو بول پڑے اس کے گواہوں کے خلاف
قاضئ شہر کچھ اس باب میں ارشاد کرے

اس کی مٹھّی میں بہت روز رہا میرا وجود
میرے ساحر سے کہو اب مجھے آزاد کرے

ملالِ تیز روی

کتنا عجب ہے یہ راگ ملن کا
کوئی بھی سُر تو نہیں کومل
ایسی شور مچاتی ہوا میں
کیسے کھِلے تن کی کونپل
اور ہردے کی وہ آنکھ
جو موہ کی رُت میں شریر سے پہلے جاگا کرتی ہے
وقت کے اتنے تیز بہاؤ میں
تجھ سے ملن کی رُت کچھ ایسے گزرتی ہے

جیسے گھنے جنگل میں سرپٹ دوڑتی ریل کی کھڑکی سے
ہاتھ بڑھا کر
کسی گھنیری شاخ کو تھامنا چاہوں
اور اپنے پھیلے ہُوئے ہاتھ پہ
ایک خراش بسا لُوں
اک انکار کی نیلی لکیر کا
اور اضافہ کر لُوں !

پذیرائی

ابھی مَیں نے دہلیز پر پاؤں رکھّا ہی تھا — کہ
کسی نے مرے سر پہ پھُولوں بھرا تھال اُلٹا دیا —
میرے بالوں پہ، آنکھوں پہ، پلکوں پہ، ہونٹوں پہ،
ماتھے پہ، رُخسار پر
پھُول ہی پھُول تھے
دو بہت مُسکراتے ہُوئے ہونٹ
میرے بدن پر محبّت کی گلنار مہروں کو یُوں ثبت کرتے
چلے جا رہے تھے
کہ جیسے ابد تک
مری ایک اک پور کا انتساب
اپنی زیبائی کے نام لے کر رہیں گے
مجھے اپنے اندر سمو کر رہیں گے !

نیگ

صبحِ وصال کی پَو پھٹتی ہے
چاروں اُور،
مدھ ماتی بھور کی نیلی ٹھنڈک پھیل رہی ہے
شگُن کا پہلا پرند
مُنڈیر پر آ کر
ابھی ابھی بیٹھا ہے
سبز کواڑوں کے پیچھے اک سُرخ کلی مُسکائی
پازیبوں کی گُونج فضا میں لہرائی
کچّے رنگوں کی ساری میں
گیلے بال چھپائے گوری
گھر کا سارا باجرہ آنگن میں لے آئی!

بے پناہی

کسی اور کے بازوؤں میں سمٹ کر
تجھے سوچنا
کس قدر منفرد تجربہ تھا!
یہ احساس ہی کس قدر جان لیوا ہے جاناں!
کہ ایسی جگہ، اس خُنک زار میں
میرے تن پر پھسلتی ہُوئی شبنمی حِدّتیں
تیری لذّت فشاں اُنگلیوں سے اگر پھُوٹتیں
تو مرے جسم کی ایک اک پور تب کس طرح جگمگاتی
ترے روشنی آشنا ہاتھ
کیسے بھٹکتے

یہاں
اب یہاں
اور اب سرخوشی کی اُس اک آخری یاد رہ جانے والی گھڑی میں......
وقت کی ناسمجھ رَو ہے
اور بے بسی کی نئی لہر ہے
زمستاں کی اس آخری شام
اور مرے جسم میں
شاید اب کوئی بھی فرق باقی نہیں
میرا ساتھی مری بند آنکھوں کو کس پیار سے چُوم کر کہہ رہا ہے
ارے — آج تو برف باری ابھی سے ہی ہونے لگی
جان! — آؤ مجھے اوڑھ لو!

اُسے کیا خبر ہے
کہ اس وقت میں آگ بھی اوڑھ لُوں تو
مری رُوح پر ہونے والی کوئی برفباری
نہیں رُک سکے گی!

ہجر کی شب کا کسی اِسم سے کٹنا مشکل
چاند پُورا ہے تو پھر درد کا گھٹنا مشکل

موجۂ خواب ہے وہ، اُس کے ٹھکانے معلوم
اب گیا ہے تو یہ سمجھو کہ پلٹنا مشکل

جن درختوں کی جڑیں دل میں اُتر جاتی ہیں
اُن کا آندھی کی درانتی سے بھی کٹنا مشکل

قوّتِ غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سمٹنا مشکل

اس سے ملتے ہوئے چہرے بھی بہت ہونے لگے
شہر کے شہر سے اِک ساتھ نمٹنا مشکل

اب کے بھی خوشوں پہ کچھ نام تھے پہلے سے لکھے
اب کے بھی فصل کا دہقانوں میں بٹنا مشکل

شکستہ پائی ارادوں کے پیش و پس میں نہیں
دل اُس کی چاہ میں گم ہے جو میرے بس میں نہیں

براہِ روزنِ زنداں ہَوا تو آتی تھی
کھُلی فضا میں گھُٹن وہ ہے جو قفس میں نہیں

قبائے جاں جسے چھُوتے ہی چمپئی ہو جائے
وہ شعلگی کسی فصلِ حنا نفس میں نہیں

کسی وصال خبر رُت کی مہرباں آمد
ہمیں قبول — مگر ہجر کے برس میں نہیں

عجیب خواب تھا آنکھیں ہی لے گیا میری
کرن کا عکس بھی اب میری دسترس میں نہیں

دلوں کا حال تو بین السّطور لکھتے ہیں
کلیدِ حرف کتابوں کے پیش رس میں نہیں

رستہ بھی کٹھن، دُھوپ میں شدّت بھی بہت تھی
سائے سے مگر اُس کو محبّت بھی بہت تھی

خیمے نہ کوئی میرے مُسافر کے جلائے
زخمی تھا بہت پاؤں مُسافت بھی بہت تھی

سب دوست مرے منتظرِ پردۂ شب تھے
دن میں تو سفر کرنے میں دِقّت بھی بہت تھی

بارش کی دُعاؤں میں نمی آنکھ کی مل جائے
جذبے کی کبھی اتنی رفاقت بھی بہت تھی

کچھ تو ترے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ مری مٹّی میں بغاوت بھی بہت تھی

پھولوں کا بکھرنا تو مقدر ہی تھا لیکن
کچھ اس میں ہواؤں کی سیاست بھی بہت تھی

وہ بھی سرِ مقتل ہے کہ سچ جس کا تھا شاہد
اور واقفِ احوال عدالت بھی بہت تھی

اس ترکِ رفاقت پہ پریشاں تو ہوں لیکن
اب تک کے ترے ساتھ پہ حیرت بھی بہت تھی

خوش آئے تجھے شہرِ منافق کی امیری
ہم لوگوں کو سچ کہنے کی عادت بھی بہت تھی

شامِ غریباں

غنیم کی سرحدوں کے اندر
زمینِ نامہرباں پہ جنگل کے پاس ہی
شام پڑ چکی تھی
ہوا میں کچّے گلاب جلنے کی کیفیت ہے
اور ان شگوفوں کی سبز خوشبو
جو اپنی نوخیزیوں کی پہلی رُتوں میں
رعنائیِ صلیبِ خزاں بنے
اور بہار کی جاگتی علامت ہُوئے ابد تک !
جلے ہُوئے راکھ خیموں سے کچھ کھُلے ہُوئے سر
ردائے عفّت اڑھانے والے بریدہ بازُو کو ڈھونڈتے ہیں

بریدہ بازو ــــ کہ جن کا مشکیزہ
ننھے حلقوم تک اگرچہ پہنچ نہ پایا
مگر وفا کی سبیل بن کر فضا سے اب تک چھلک رہا ہے

برہنہ سر بیبیاں
ہَواؤں میں سُوکھے پتّوں کی سرسراہٹ پہ
چونک اُٹھتی ہیں
بادِ صرصر کے ہاتھ سے بچنے والے پھُولوں کو چُومتی ہیں
چھپانے لگتی ہیں اپنے اندر
بدلتے، سفّاک موسموں کی اداشناسی نے
چشمِ حیرت کو سہم ناکی کا مستقل رنگ دے دیا ہے
نگاہِ تخئیل دیکھتی ہے
چمکتے نیزوں پہ سارے پیاروں کے سر سجے ہیں
کٹے ہُوئے سر
شکستہ خوابوں سے کیسا پیمان لے رہے ہیں
کہ خالی آنکھوں میں روشنی آتی جا رہی ہے!

اِدرکنی

خیمۂ بے گناہی سے میں
شہرِ انصاف کی سمت جونہی بڑھی
اپنی اپنی کمیں گاہ سے
میرے قاتل بھی نکلے
کمانیں کسے، تیر جوڑے، طمنچے چڑھائے
مچانوں پہ ناوک بدستوں کو تیّار رہنے کے احکام
دیتے ہُوئے
شاہراہوں میں پیاسی سنانیں لئے فتنہ گر صف بہ صف
چوک پر قاضیٔ شہر خنجر بکف
راستے دشنہ در آستیں

گھات میں شہر کا ہر مکیں
میرے تنہا کجاوے کی آہٹ کو سُنتے ہُوئے
عنکبوتی ہُنر میرے چاروں طرف جال بُنتے ہوئے
کوئی میرے علم کا طلبگار
کوئی میرے سَر کا خواہاں
تو کوئی ردا کا تمنائی بن کر
جھپٹنے کو ہے
حلقۂ دُشمناں تنگ ہونے کو ہے
موت سے آخری جنگ ہونے کو ہے
کُوفۂ عشق میں
میری بے چارگی
اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے
ہاتھ باندھے ہُوئے
سر جھکائے ہُوئے
زیرِ لب ایک ہی اِسم پڑھتی ہُوئی
یا غفُور الرّحیم !
یا غفُور الرّحیم !

علیؑ مُشکل کُشا سے !

مولا !
یہ کیسا دُکھ ہے
جس کی گرہیں تجھ سے بھی کھُلنے نہیں پاتیں
تیرے نام کا جادُو اب تک
کیسے کیسے سحر کو کاٹتا آیا
کہاں کہاں گرنے سے بچایا
کیسے کیسے دشتِ بلا میں آبِ تیغ کی پیاس بنا
کس کس کُوفے، کس کس شام میں پامردی کی اساس بنا

لیکن سورج خوروں کی اس بستی تک آ کر تو
تیرا نام بھی رُک جاتا ہے
فاتحِ خیبر!
اپنے ہاتھوں کو پھر جُنبش دے
ہم اپنی نامرد انا سے ہار چُکے
ساقئ کوثر!
ایک دفعہ نظریں تو اُٹھا
دیکھ کہ تیرے ماننے والے
ذرا سی پیاس پہ کیسے فرات کو وار چکے!

تقیّہ

سو اب یہ شرطِ حیات ٹھہری
کہ شہر کے سب نجیب افراد
اپنے اپنے لہُو کی حُرمت سے منحرف ہو کے جینا سیکھیں،
وہ سب عقیدے کہ ان گھرانوں میں
ان کی آنکھوں کی رنگتوں کی طرح تسلسل سے چل رہے تھے
سُنا ہے باطل قرار پائے،
وہ سب وفاداریاں کہ جن پہ لہُو کے وعدے حلف ہُوئے تھے
وہ آج سے مصلحت کی گھڑیاں شمار ہوں گی

بدن کی وابستگی کا کیا ذکر
رُوح کے عہد نامے تک فسخ مانے جائیں!
خموشی و مصلحت پسندی میں خیریت ہے
مگر مرے شہر منحرف ہیں
ابھی کچھ ایسے غیوُر و صادق بقیدِ جاں ہیں
کہ حرفِ انکار جن کی قیمت نہیں بنا ہے
سو حاکمِ شہر جب بھی اپنے غُلام زادے
انھیں گرفتار کرنے بھیجے
تو ساتھ میں ایک ایک کا شجرۂ نسب بھی روانہ کرنا
اور ان کے ہمراہ سرد پتھر میں چُننے دینا
کہ آج سے جب،
ہزار ہا سال بعد ہم بھی
کسی زمانے کے ٹیکسلا یا ہڑپّہ بن کر تلاشے جائیں
تو اس زمانے کے لوگ
ہم کو
کہیں بہت کم نسب نہ جانیں!

جتنا ہو فزوں عطائے رب ہے
تخلیق کا کرب بھی عجب ہے

اس خواب کی لَو کو مت بجھانا
یہ میرا چراغِ نیم شب ہے

سُورج نے کبھی تو سوچا ہوتا
کیا میرے زوال کا سبب ہے

کب اس کے وصال میں ہُوا تھا
وہ حال جو تیرے دل کا اب ہے

ملنے کا تو مسئلہ نہیں ہے
پہچان بھی پائیے، بات تب ہے

خود ڈھونڈ رہا ہے آبِ حیواں
اور پیچھے قبیلہ جاں بلب ہے

بچھڑا ہے جو اک بار تو ملتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سِلتے نہیں دیکھا

اِک بار جسے چاٹ گئی دُھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اُس پھُول کو کھِلتے نہیں دیکھا

یک لخت گرا ہے تو جڑیں تک نکل آئیں
جس پیڑ کو آندھی میں بھی ہلتے نہیں دیکھا

کانٹوں میں گھِرے پھُول کو چُوم آئے گی لیکن
تتلی کے پَروں کو کبھی چھِلتے نہیں دیکھا

کس طرح مری روح ہری کر گیا آخر
وہ زہر جسے جسم میں کھِلتے نہیں دیکھا

تجھ سے تو کوئی گِلہ نہیں ہے
قسمت میں مری، صِلہ نہیں ہے

بچھڑے تو نجانے حال کیا ہو
جو شخص ابھی مِلا نہیں ہے

جینے کی تو آرزو ہی کب تھی
مرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے

جو زیست کو معتبر بنا دے
ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے

خوشبو کا حساب ہو چکا ہے
اور پھول ابھی کھِلا نہیں ہے

سرشاریٔ رہبری میں دیکھا
پیچھے مرا قافلہ نہیں ہے

اِک ٹھیس پہ دل کا پھوٹ بہنا
چھونے میں تو آبلہ نہیں ہے!

بدن تک موجِ خواب آنے کو ہے پھر
یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر

ہری ہونے لگی ہے شاخِ گریہ
سرِ مژگاں گلاب آنے کو ہے پھر

اچانک ریت سونا بن گئی ہے
کہیں آگے سراب آنے کو ہے پھر

زمین انکار کے نشّے میں گم ہے
فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

بشارت دے کوئی تو آسماں سے
کہ اک تازہ کتاب آنے کو ہے پھر

دریچے میں نے بھی وا کر لیے ہیں
کہیں وہ ماہتاب آنے کو ہے پھر

جہاں حرفِ تعلّق ہو اضافی
محبّت میں وہ باب آنے کو ہے پھر

گھروں پر جبر یہ ہو گی سفیدی
کوئی عزّت مآب آنے کو ہے پھر

فصیلِ شہر پر تھی ضربِ کاری
کماں داروں کا شوقِ شہریاری

کہاں فن کار کو مر کے بھی حاصل
عذابِ زندگی سے رستگاری

ہجومِ رنگ میں بھی دل کا مسلک
کسی عہدِ وفا کی پاسداری

اسی چہرے سے اوروں کی پرکھ ہے
ابھی تک ہے وہی اِک شکل پیاری

وہ جب خود ٹوٹنے والا ہُوا تھا
میں ہاری بھی تو کیسے وقت ہاری

زمیں ماں کی طرح ہے، ہر ستم پر
بس اِک حرفِ دُعا ہونٹوں سے جاری

ق

کسی بیمار کی بیعت میں روشن
ہماری گردنوں پر سُرخ دھاری

اسیرِ کربلا جب یاد آئیں
کہاں لگتی ہے پھر زنجیر بھاری

.... بدتر از گنہ

سو یہ طے پایا
کہ اس شہد بھری نیند کا رس
میری آنکھوں کے سوا بھی کوئی پی سکتا ہے
اور وہ سرشاری
جو اَب تک کسی منتر کی طرح
صرف مجھے پڑھتی تھی
اب کسی اور بدن کو بھی یونہی وردِ زباں جانے گی
وہی لمحے ــــ اسی شدّت سے
ترے خوں میں ستاروں کی طرح دمکیں گے

جن کی تنویر ابھی تک مری تقدیر رہی
آج معلوم ہُوا،
بند پلکوں کے عقب میں کسی جگنو کی طرح
جس کو چھپا لیتی تھیں تیری پلکیں
وہ مرا عکس نہ تھا ــــ وہ مری تصویر نہ تھی
خوابِ یکتائی کی میرے ــــ کوئی تعبیر نہ تھی
تیرا دلدار تبسّم آخر
ناخنِ عذر سے کیا دل کی گرہ کھولے گا
آنکھ جب جھوٹ کہے
آئینہ کیا بولے گا؟

سنگ پگھل بھی جاتے ہیں
جادُو چل بھی جاتے ہیں

دیر تلک نم رہنے سے
آنچل گَل بھی جاتے ہیں

دو رویہ پیڑوں کے بیچ
رستے جل بھی جاتے ہیں

صرف ہَوا پر کیوں تعزیر
پھُول مسل بھی جاتے ہیں

بس تریاق نہ کھوج کے بیٹھ
سانپ نِگل بھی جاتے ہیں

طاؤسی یادوں کے دُکھ
زخم کو جھل بھی جاتے ہیں

دیکھ اپنی شادابی کو
آنسُو پھل بھی جاتے ہیں

دریا پار یہ سوچ کے چل
گھڑے بدل بھی جاتے ہیں

خزاں کی رُت میں لمحۂ جمال کیسے آگیا
یہ آج پھر سنگھار کا خیال کیسے آگیا

ہنسی کو اپنی سُن کے ایک بار میں بھی چونک اُٹھی
یہ مجھ میں دُکھ چھپانے کا کمال کیسے آگیا

وہ رسمِ چارہ سازیٔ جنوں تو ختم ہو چکی
یہ دل کے نام حرفِ اندمال کیسے آگیا

ابھی تو دُھوپ روزنِ قفس سے کوسوں دُور تھی
ابھی سے آفتاب کو زوال کیسے آگیا

جدائیوں کے زخم تو، سُنا کہ، بھر چلے تھے پھر
بدن کے ہاتھ ناخنِ وصال کیسے آگیا

تمام کائنات ازل سے آئینوں کی زد پہ تھی
ہجومِ عکس میں یہ بے مثال کیسے آگیا

گھر کی یاد ہے اور درپیش سفر بھی ہے
چوتھی سمت نکل جانے کا ڈر بھی ہے

لمحۂ رُخصت کے گونگے سناٹے کی
ایک گواہ تو اس کی چشمِ تر بھی ہے

عشق کو خود دریوزہ گری منظور نہیں
مانگنے پر آئے تو کاسۂ سر بھی ہے

نئے سفر پہ چلتے ہوئے یہ دھیان رہے
رستے میں دیوار سے پہلے در بھی ہے

جن چیزوں کے ہرا رہنے کی دُعا تھی
ان میں آج سے شامل زخمِ ہُنر بھی ہے

بہت سے ناموں کو اپنے سینے میں چھپائے
جلی ہُوئی بستی میں ایک شجر بھی ہے

وہی خیال کہ آنکھوں تک رہ جائے تو اشک
مصرعۂ تر بن جائے تو سلکِ گہر بھی ہے

سُوکھ گیا خود اپنے دل کی نرمی سے
پیڑ کو کیا معلوم تھا، بیل امر بھی ہے

غزالِ شوق کی وحشت عجب تھی
کسی خوش چشم سے نسبت عجب تھی

ہجومِ چشم و رُخسار و دہن میں
جو تنہا کر گئی صُورت عجب تھی

وہ تردیدِ وفا تو کر رہا تھا
مگر اس شخص کی حالت عجب تھی

مری تقدیر کی نیرنگیوں میں
مری تدبیر کی شرکت عجب تھی

سرِ مقتل کسی کے پیرہن میں
گلابی رنگ کی حِدّت عجب تھی

بدن کا پہلے پہلے آگ چکھنا
رگ و پے میں کوئی لذّت عجب تھی

گنگا سے

جُگ بیتے
دجلہ سے اک بھٹکی ہُوئی لہر
جب تیرے پوتّر چرنوں کو چھُونے آئی تو
تیری ممتا نے اپنی باہیں پھیلا دیں
اور تیرے ہرے کناروں پر تب
اننّاس اور کٹھل کے جھُنڈ میں گھِرے ہُوئے
کھپریلوں والے گھروں کے آنگن میں کلکاریاں گونجیں
میرے پرکھوں کی کھیتی شاداب ہُوئی

اور شگن کے تیل نے دیے کی لَو کو اُونچا کیا
پھر دیکھتے دیکھتے
پیلے پھُولوں اور سُنہری دِیوں کی جوت
ترے پھُولوں والے پُل کی قوس سے ہوتی ہُوئی
مہران کی اور تک پہنچ گئی
میَں اسی جوت کی ننّھی کرن
پھُولوں کا تھال لیے تیرے قدموں میں پھر آ بیٹھی ہُوں
اور تجھ سے اب بس ایک دیا کی طالب ہُوں
یوں اَنت سمے تک تیری جوانی ہنستی رہے
پر یہ شاداب ہنسی
کبھی تیرے کناروں کے لب سے
اتنی نہ چھلک جائے
کہ میری بستیاں ڈوبنے لگ جائیں
گنگا پیاری!

یہ جان
کہ میرے روپہلے راوی اور بھورے مہران کی گیلی
مٹھی میں

مری ماں کی جان چھپی ہے
مری ماں کی جان نہ لینا
مجھ سے مرا مان نہ لینا!

تاج محل

سنگِ مرمر کی خُنک بانہوں میں
حسنِ خوابیدہ کے آگے مری آنکھیں شل ہیں
گُنگ صدیوں کے تناظر میں کوئی بولتا ہے
وقت جذبے کے ترازُو پہ زر و سیم و جواہر کی تڑپ
تولتا ہے!

ہر نئے چاند پہ پتھّر وہی سچ کہتے ہیں
اسی لمحے سے دمک اُٹھتے ہیں ان کے چہرے
جس کی لَو، عمر گئے، اِک دلِ شب زاد کو مہتاب
بنا آئی تھی!

اسی مہتاب کی اک نرم کرن
سانچۂ سنگ میں ڈھل پائی تو
عشق رنگِ ابدیت سے سرافراز ہُوا

کیا عجب نیند ہے
جس کو چھُو کر
جو بھی آتا ہے کھُلی آنکھ لیے آتا ہے
سو چکے خوابِ ابد دیکھنے والے کب کے
اور زمانہ ہے کہ اس خواب کی تعبیر پہ جاگ رہا ہے
اب تک !

بُوئے یاسمن باقیست

(نذرِ فراق)

سبز دنوں کا سب سے تناور پیڑ
ہَوا کے آگے اب بے بس ہے
پتّے اک اک کر کے گرتے جاتے ہیں
وہی شاخ کہ کبھی دُلہن کی طرح پھُولوں سے لد کر بھی
کیسی تیکھی سرشاری سے تنی رہتی تھی
آج اپنے سب گہنے اُتار چکی ہے —— پھر بھی خمیدہ ہے
وہی تنا —— جو برف کے ہر موسم کے بعد
ننھّی ننھّی ہری ستاروں جیسی کونپلوں سے بھر جاتا تھا
آج اس پر بس چیونٹیاں چلتی نظر آتی ہیں
وہی شگوفے جن سے لپٹ کر دُھوپ کبھی ہنستی

تو رنگوں اور کرنوں کے چہرے گڈمڈ ہو جاتے
اس کی بھی ساری پنکھڑیاں رزقِ ہَوا کہلائیں
سبز دنوں کا سب سے تناور پیڑ ـــ آخر
اپنی ہر ممکن ہریالی کما چکا
اور اب خاموشی سے اپنے ہونے کی مجبوری کا
وعدہ معاف گواہ بنا استادہ ہے
اور وقت کی اٹل شہادت پر
اپنے فیصلہ کُن لمحے کا رستہ دیکھ رہا ہے
تنہا ـــ اور تہی داماں
سبز لباسی گئے جنم کی بات ہُوئی
پھر یہ برہنہ شاخوں سے چھن چھن کر
اتنی ٹھنڈی چھاؤں کہاں سے آتی ہے
بن پھُولوں کے
خوشبُو کیسے پھیل رہی ہے ؟

قرۃالعین حیدر

جیون زہر کو متھ کر امرت نکالنے والی موہنی
بھرا پیالہ ہاتھوں میں لیے پیاسی بیٹھی ہے
وقت کا راہو گھونٹ پہ گھونٹ بھرے جاتا ہے
دیوی بے بس دیکھ رہی ہے !
پیاس سے بیکل ہے ـــ اور چُپ ہے !
ایسی پیاس کہ جیسے
اس کے ساتوں جنم کی جیبھ یہ کانٹے گڑے رہے ہوں
ساگر اس کا جنم بھون

اور جَل کو اس سے بَیر
ریت پہ چلتے چلتے اب تو جلنے لگے ہیں پیَر !
ریت بھی ایسی، جس کی چمک سے ،
آنکھیں جُھلس گئی ہیں
طیّب رزق کی دُعا قبول ہُوئی آخر
آبِ زر سے نام لکھے جانے کی تمنّا بھی بَر آئی — لیکن
پیاسی آتما سونا کیسے پی لے ؟
اِک سنسار کو روشنی بانٹنے والا سُورج
اپنے برج کی تاریکی کو
کس ناخن سے چھیلے
شام آتے آتے کالی دیوار پھر اُونچی ہو جاتی ہے !

سلمیٰ کرشن

تُو ہے رادھا اپنے کرشن کی
ترا کوئی بھی ہوتا نام
مُرلی ترے بھیتر باجتی
کسی بَن کرتی بسرام
یا کوئی سنگھاسن براجتی
تجھے کھوج ہی لیتے شیام
جس سنگ بھی پھیرے ڈالتی
سنجوگ میں تھے گھنشیام

کیا مول تو من کا مانگتی
بِکنا تھا تجھے بے دام
بنسی کی مدھر تانوں سے
بسنا تھا یہ سُونا دھام
ترا رنگ بھی کونسا اپنا
موہن کا بھی ایک ہی کام
گردھر آ کر بھی گئے اور
من مالا ہے وہی نام
جوگن کو پتہ بھی کیا ہو
کب صبح ہُوئی کب شام!

میکبتھ

دشتِ شب رنگ کے اک ٹیلے پر
تین ہم ذات چڑیلوں کی ملاقات ہے پھر
اپنے منتر میں کسی نام کو دہراتے ہُوئے
سانپ کی آنکھوں سے اطراف و جوانب پر نظر رکھتے ہُوئے
گدھ کی ناقابلِ تسکیں، ازلی بھُوک کے ساتھ
سُرخ ہونٹوں پہ زباں پھیرتی ہیں
حرفِ تحریص کے زہرابِ ہلاہل ڈبوئی ہوئی خوش لمس نوید

اُس تہی زاد کو دینے کے لیے بیٹھی ہیں
جس کے کیسے میں تشکّر کا کوئی لعل نہیں

ہو چکی طالبِ منصب کو بھی جمشید کلاہی کی خبر
زندگی بھر کی رفاقت کے چلو دام چکے
لیکن اُس خنجرِ گل فام کا کیا ہو
کہ لرزتے ہُوئے ہاتھوں میں ابھی تک ہے ـــــ اور
جس کی خوشبُو سے در و بام کے اعصاب تنے جلتے ہیں!

کانپتے دل کی خود آسیبی میں
آنکھ میں نیند کہاں
چونکتی آنکھوں کا مقسُوم ہی بیداری ہے
نیند مچھلی کی طرح ہاتھ سے کچھ ایسے پھسل جاتی ہے

جیسے اس کو کسی بدخواب کی آگاہی ہو
آنکھ کی طرح یہ بے خواب گھڑی
دستِ لرزیدہ پہ بھی آئی ہے
ساحلِ بحرِ عرب کے لب سے
مُشک و عنبر کی طلب ایک عجوزہ کو بھی ہے
ہاتھ پانی میں ہے
اور آنکھ میں در آئی ہے
ساری دُنیا کے سمندر کی تلاش!

اے مرے شہرِ رسن بستہ

اے مرے شہرِ رسن بستہ، ترے بازو کے نیل
اتنے گہرے ہو چکے ہیں اب
کہ تیری رُوح پر دِکھنے لگے
اور ترے ماتھے پہ کوئی بل نہیں!
مَیں ترے طرزِ توکّل پر بہت حیران ہُوں!
ان اذیّت ناک نیلی دھاریوں کو
کیا کلاہِ زخم زدہ میں
تکمۂ نیلوفری سمجھا ہے تُو؟

اس قدر سفّاک لمحوں کے نشانوں سے بھری اس پیٹھ کو
کس نے پُشتِ لاجوردی کہہ کے بہلایا تجھے؟
یا اسے بھی اِک عطائے خسُروی سمجھا ہے تُو؟
یہ تو تیری سات پُشتوں کے لیے وہ تازیانہ ہے
کہ جس کے گھاؤ
جب بھرنے کو آئیں گے
تو تیرے حافظے کے سارے ناخن یک بیک بڑھ
آئیں گے!
شہریاروں کے نشاطِ حسنِ بازی کے لیے
سجدہ گاہِ عشق کو رُسوا نہ کر
روشنی کی بے رُخی پر کورچشمی کو رضائے رب نہ کہہ
اپنے تارے کو تلاش
اپنی کم گوشی کی دُھن میں زندگی کے بے صدا ہونے پہ
مت اصرار کر
پاؤں آ کر تو ہر زنجیر بول اُٹھتی ہے دوست

دیر بس ہلنے کی ہے
رُوح کے چھلنے کی ہے
اک دفعہ بس چوٹ کی گہرائی کوئی جان لے
ایک لمحے کے لیے رُسوائی کے آسیب کو پہچان لے !
ایک بار احساس آنکھیں مل کے اُٹھ جائے تو پھر
تجھ کو گہنوں کی طرح پہنی ہُوئی زنجیر بھی بھاری لگے
صحنِ زنداں سے اُدھر کی زندگی پیاری لگے !

وَاُوفَ بِعَہدِکَ

(حضرت امام حسینؓ کے آخری الفاظ)

کنارِ دریا
اب آخری بار رَن پڑا ہے
علم کی نصُرت کو جانے والے وہی جری پاس بچ رہے ہیں
کہ جو مری ذُرّیت میں ہیں،
اور جاں سپاری
جنھیں اب وجد سے ورثۂ افتخار بن کر عطا ہُوئی ہے !
لڑائی کی رات
گفتگو میں وہ لمحہ آیا تھا
جبکہ مَیں اپنے خیمے کے سب دِیے بُجھا کر چلا گیا تھا،

مرے رفیقوں کی مشکلیں کچھ تو سہل ہوتیں
مگر چراغوں کی لَو بڑھانے کے ساتھ ہی
فیصلے کی ساعت گزر چکی ہے
مبارزت کی نوید میرے شجیع لوگوں کو مل چکی ہے
مرے ہراول جوان ایک ایک کر کے کام آ رہے ہیں
مجھ کو — یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہو چکی ہے
کہ میرا پرچم ہَوا کے آگے زیادہ عرصے نہیں رُکے گا!
سبھی طرف سے غنیم گھیرے کو تنگ تر کرتا جا رہا ہے
یہ ہاتھ سے ڈھال چھُوٹنے کی صدا مجھے کس طرف سے آئی
گماں ہے شاید مرا کوئی شہسوار گھوڑے سے گر گیا ہے!
مرے یمین و یسار نیزوں کی زد پہ ہیں
میرا قلب پہلے ہی برچھیوں سے چھدا پڑا ہے
عقب تک اب تو بجھے ہُوئے تیر آ رہے ہیں!
وہ رَن پڑا ہے کہ صحنِ مقتل ہماری لاشوں سے پٹ گیا ہے
برہنہ لاشوں کو اب تو گھوڑے بھی روند کر آگے جا چکے ہیں

میَں بکھرے ٹکڑوں کو جمع کرتے
بریدہ سر سے بدن کی نسبت تلاش کرتے
کنارۂ رُوح تک شکستہ ہُوں — تھک گیا ہُوں
بہت کڑا وقت ہے کہ اس مجمعٔ عزیزاں میں آج تنہا کھڑا
ہُوا ہُوں!

تمام زخموں سے چوُر ہُوں میں
مگر شہادت گہِ وفا میں
لہُو سے رسمِ وضو کی تکمیل کرنے سے قبل
اپنے سجدے کی مستجابی کی تہنیت مجھ کو مل چکی ہے!
مرا یہ اعزاز کم نہیں ہے
کہ اتنے تیروں میں ایک بھی تیر وہ نہیں تھا
کہ جو کسی پُشت سے نکالا گیا ہو
ہنگامِ عصر — مقتل سے سرخرُو ہُوں
کہ میرے توشے میں جتنے وعدے تھے — اتنے سر ہیں!

کسے کہ کُشتہ نہ شُد

سُنا ہے خسروِ دوراں کی کجکلاہی کو
کشیدہ قامتیٔ عصر خوش نہیں آئی
بزن کے حکم سے لرزاں چلا جو ہر کارہ
تو اپنے منصبِ عقبیٰ شکار سے آگاہ
ارادۂ شۂ والا معتبر کرنے
فقیہہِ شہر مناسب جواز لے آیا
طلائی طشت میں تازہ گلاب سجنے لگے
ذرا اُٹھے تھے کہ نیزوں پہ سر پہنچنے لگے

عبا و جبّہ و دستار بے ہُنر ٹھہرے
ازل کے کور نظر آج دیدہ ور ٹھہرے
کنارہ کرتے ہُوئے دوست شرمسار نہیں
وہ ابتلا ہے کہ سائے کا اعتبار نہیں
وہ تیرگی ہے کہ اُمیدِ اجر دل میں نہیں
دُعائیں مانگتے ہیں اور صبر دل میں نہیں
مگر وہ لوگ کہ جن کا یقین زندہ تھا
اُمیدِ اجر پہ جن کا چراغ جلتا تھا
وہ ایک نام کی نسبت سے معتبر اب بھی
وہ ایک زخم کے رشتے سے دوست تر اب بھی
نہ ان کو تخت سے مطلب، نہ لوح کی خواہش
نہ مصلحت کی اسیری، نہ جاہ سے سازش
نجابتوں کے تقاضے کچھ اور ہوتے ہیں
درونِ شہر جہاں جشنِ قتلِ عام ہُوا

حضورِ شاہ سبھی جاں گزارنے آئے
زباں کا قرض لہو سے اُتارنے آئے
ہوا نے جتنے دِیے مانگے نذر کر ڈالے
کہ روشنی کا نسب صرف بام و در سے نہ تھا
اور آنے والی کسی سرد رات کی خاطر
کوئی چراغ بچا تھا۔ تو میرے گھر سے نہ تھا!

اے جگ کے رنگ ریز

اے جگ کے رنگ ریز
مری بھی اوڑھنی رنگ دے
میں پنگھٹ پر کیسے جاؤں
بھیگے پلّو سے ہاتھوں کو بچاتی سکھیاں
مجھ پر ہنستی ہیں!
مَیں نے سو سو جتن کیے
پر مجھ پر رُوپ نہ آیا
کیسر پنکھڑی، حنا کے پتّے، ہار سنگھار کے ڈنٹھل
اور کُسم کے پھول

سب آنچل میں بندھے رہ گئے
کوئی مرے کام نہ آیا
گہنے پاتے گئے اکارت
پتی کا پیار بھی مری کایا بدل نہ پایا
رہی مری چُنری پھیکی کی پھیکی
ہاں ـــ بس اک رُت ایسی آئی تھی
جب مجھ پر ہریالی ٹوٹ کے چھائی تھی
تن کے سُندر بن میں ساتوں رنگ کے پھُول کھِل اُٹھے تھے!
لیکن پہلی ہی بارش میں
جل گئے سارے پھُول
ایک ذرا سی دُھوپ ہوئی
اور پل بھر میں سب دُھول
دُھوپ کڑی تھی یا پھر رنگ ہی کچّے تھے
اب تک جان نہ پائی
بس اتنا بھر دیکھ سکی ہُوں
اے جگ کے رنگ ریز!

تری مٹھی میں دھنک ہے
بادل، جل، آکاش، چندرما، کمل، چنبیلی، دُوب
اُودا، اُجلا، نیلا، پیلا، سُرخ، روپہلا، سبز
اتنے سارے رنگوں میں
مرے نام کا کوئی رنگ تو ہوگا
خسرو مُرشد!
اپنے ہاتھ سے میرے تن پر مل دے
اور جو تجھے یہ بھی نہ سہائے
مجھے اپنے رنگ میں رنگ لے!

اپنے قائدؒ کے لیے کچھ حرف

بے آب آئنوں پہ طلسمِ نظر کھُلا
چشمِ فسوں زدہ سے کوئی خواب گر کھُلا

اک شخص کو کلیدِ محبّت عطا ہُوئی
تنہائیوں پہ شہرِ رفاقت کا در کھُلا

اک سرخوشی میں چلتے رہے اُس کے ساتھ ساتھ
منزل پہ آ گئے تو کمالِ سفر کھُلا

ٹھنڈا ہُوا اِدھر عَلمِ جاں فروشگاں
شہرِ وفا میں رُوح کا پرچم اُدھر کھُلا

اک حرفِ سبز شاخِ بدن پر چمک اُٹھا
میری زمیں پہ اپنے لہُو کا ہنر کھُلا

ننھّے سے اک ستارے کی کیا روشنی مگر
پرچم پہ آ گیا تو بہت چاند پر کھُلا

وہ وقت تھا کہ تھی بھی ضروری ردائے سبز
آندھی میں کون دیکھتا مٹّی کا سر کھُلا

لمسِ زر

کیمیا گر یہ کہتے ہیں
بعض شرابیں اپنے وصف میں اتنی عجیب ہوتی ہیں
کہ جب تک
جامِ سفالیں میں رکھی جائیں
تو ان کا نشّہ
اپنے خُمار تک
مے خواروں کے حق میں امرت رہتا ہے
اور جیسے ہی سونے کے پیالوں میں اُنڈیلی جائیں

تو امرت ـــــ زہرِ ہلاہل بن جاتا ہے
آج اپنے محبُوب ـــــ مگر مرحُوم سخن ور کو مَیں نے
جب کُرسیٔ اعلیٰ پر بیٹھے
اور تیسرے درجے کے مہمل اشعار سُناتے دیکھا تو
مجھ کو یہ معلُوم ہُوا
ایسی عجیب شرابوں میں
ایک شرابِ سُخن بھی ہے !

مارگزیدہ

معصُومیت اور حماقت میں پل بھر کا فاصلہ ہے !
میری بستی میں پچھلی برسات کے بعد
اک ایسی اعصاب شکن خوشبُو پھیلی ہے
جس کے اثر سے
میرے قبیلے کے سارے زیرک افراد
اپنی اپنی آنکھوں کی جھلّی مٹیالی کر بیٹھے ہیں
سادہ لوح تو پہلے ہی
سرکنڈوں اور چنبیلی کے جھاڑوں کے پاس

بے سُدھ پائے جاتے تھے
دہن کے اندر گھُلتے ہی
نیم کے پتّوں کا یوں برگِ گلاب ہو جانا تو مجبُوری تھی
حیرت تو اس بات پہ ہے کہ
آگ کے پودوں کی موجودگی کے باوصف ،
وارثِ تسنیم و کوثر
ایسی لعاب آلُود مٹھاس کو آبِ حیات سمجھ بیٹھے ہیں
معصُومیّت اور حماقت میں پل بھر کا فاصلہ ہے !

تو برمن بلا شُدی

کچّے ذہن اور کچّی عُمر کی لڑکیاں
اپنی خوُبی میں
مائع جیسی ہوتی ہیں
جس برتن میں ڈالی جائیں
اُسی شکل میں کیسے مزے سے ڈھل جاتی ہیں !
کیسا چھلکنا، کیسا اُبلنا اور کہاں کا اُڑنا !
اور اک میَں ہوں — پتھّر اور شوریدہ مزاج !
کاسۂ خالی میں بے وجہ سما جانے کی بجائے
اُس سے اس قوّت سے ٹکرانا چاہوں کہ
ظرفِ تہی کی گُونج سے اس کا بھرم کھُل جائے !

میَں نے آئینے کو کب جھُٹلایا ہے !
ہاں — گہنے مجھ پر بھی اچھے لگتے ہیں
لیکن جب بھی مجھ کو ان کا مول کبھی یاد آتا ہے تو
کنگن بچھّو بن جاتے ہیں
اور پازیبیں ناگ کی صُورت میرے پاؤں جکڑ لیتی ہیں !
بہت ہی میٹھے بولوں کا جزوِ اعظم
جب حالتِ خام میں مجھ کو نظر آجاتا ہے
دہشت سے مری آنکھیں پھیلنے لگتی ہیں
اور اس خوف سے میری ریڑھ کی ہڈّی جمنے لگتی ہے کہ
ان ہی مادر زاد منافق لوگوں میں
مجھ کو ساری عمُر بسر کرنی ہے !

کبھی کبھی ایسا بھی ہُوا ہے
میَں نے اپنا ہاتھ اچانک کسی اور کے ہاتھ میں پایا
لیکن جلد ہی میری ضرورت سے زاید بے رحم بصارت نے
یہ دیکھ لیا ہے

یا تو میرے ساتھی کی پرچھائیں نہیں بنتی ہے
یا پھر مٹّی پر
اُس کے پنجے اُس کی ایڑی سے پہلے بن جاتے ہیں
انسانوں کی سایہ رکھنے والی نسل ناپید ہُوئی جاتی ہے !
شام کے ڈھل جانے کے بعد
جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے ہیں
مَیں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہُوں
اور اپنی چادر پر تازہ دھبّے بنتے دیکھتی ہُوں
کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی کہنا
نہیں آتی
مَیں — آقائے ولی نعمت کو
خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہُوں !

ظلِّ الٰہی کے پرابلمز

راج پاٹ کرنے والوں کی جان
ہتھیلی پر رہتی ہے
بے چاروں کے مسائل کیسے عجب ہوتے ہیں
کبھی اس باجگزار ریاست کی شوریدہ سری
کبھی اُس زیرِ نگیں صوُبے کی نافرمانی
کبھی خود پایۂ تخت کے اندر غیر مناسب بیداری
کبھی سپہ سالارِ اعظم کا شوق لشکر آرائی
کبھی امیرِ مطبخ کی خاصے میں خاصی غیر ضروری دلچسپی

شہزادوں کی شورہ پشتی
حرم سرا میں پلنے والی چھوٹی بڑی سیاست
بالاعلان بغاوت، درپردہ سازش !

دُشمن جلد ہی کُھل جاتے ہیں
ان سے نبٹنا اتنا مشکل کام نہیں
اُلجھاوا تو پاؤں چُومنے والوں سے پڑتا ہے !
اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں
ایک تو کُتّے ——
اپنی وفاداری میں شہرۂ عالم رکھنے والے
جب تک جی چاہے پیروں میں لوٹتے ہیں
پھر اپنی اپنی ہڈی لے کر الگ ہو جاتے ہیں
دوسری قسم زیادہ مہلک ہے
یہ دو پیروں پر چلتی ہے
دیکھنے میں انسان مگر باطن کے ریچھ
تلوے چاٹتے چاٹتے اپنے پیارے آقا کو ایسا کر دیتے ہیں کہ

ایک سُہانی صُبح کو جب
اپنی کنیزِ خاص کی بھیرویں سُن کر آنکھیں کھولتے ہیں تو
ظلِّ الٰہی
اپنے پاؤں ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں !

اُسی طرح سے ہر اک زخم خُوشنما دیکھے
وہ آئے تو مجھے اب بھی ہرا بھرا دیکھے

گزر گئے ہیں بہت دن رفاقتِ شب میں
اک عُمر ہو گئی چہرہ وہ چاند سا دیکھے

مرے سکُوت سے جس کو گِلے رہے کیا کیا
بچھڑتے وقت ان آنکھوں کا بولنا دیکھے

ترے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

بس ایک ریت کا ذرّہ بچا تھا آنکھوں میں
ابھی تلک جو مُسافر کا راستہ دیکھے

اُسی سے پوچھے کوئی دشت کی رفاقت ــــ جو
جب آنکھ کھولے، پہاڑوں کا سلسلہ دیکھے

تجھے عزیز تھا اور مَیں نے اُس کو جیت لیا
مری طرف بھی تو اک پل ترا خُدا دیکھے

موجیں بہم ہُوئیں تو کنارہ نہیں رہا
آنکھوں میں کوئی خواب دوبارہ نہیں رہا

گھر بچ گیا کہ دُور تھے، کچھ صاعقہ مزاج
کچھ آسمان کا بھی اشارہ نہیں رہا

بھُولا ہے کون ایڑ لگا کر حیات کو
رُکنا ہی رخشِ جاں کو گوارا نہیں رہا

جب تک وہ بے نشاں رہا، دسترس تھا
خوش نام ہو گیا تو ہمارا نہیں رہا

گُم گشتۂ سفر کو جب اپنی خبر ملی
رستہ دکھانے والا ستارہ نہیں رہا

کیسی گھڑی میں ترکِ سفر کا خیال ہے
جب ہم میں لوٹ آنے کا یارا نہیں رہا

جزیہ

گڑیا سی یہ لڑکی
جس کی اُجلی ہنسی سے
میرا آنگن دمک رہا ہے
کل جب سات سمندر پار چلی جائے گی
اور ساحلی شہر کے سُرخ چھتوں والے گھر کے اندر
پُورے چاند کی روشنی بن کر بکھرے گی
ہم سب اس کو یاد کریں گے
اور اپنے اشکوں کے سچے موتیوں سے
ساری عُمر
اک ایسا سُود اُتارتے جائیں گے،
جس کا اصل بھی ہم پر قرض نہیں تھا!

کنیّا دان

بال صندل کے پانی میں بھیگے ہُوئے
جسم چندن کے مس سے دمکتا ہُوا
آنکھ خوابوں کی افشاں سے بوجھل بہت
ہونٹ پر اَن کہی کا مزہ !
گوری گوری کلائی سے لپٹی ہُوئی موتیے کی لڑی
سُرخ زرتار جوڑے میں سمٹی ہُوئی ایک کچّی کلی
گاہے گاہے جھلکتی ہُوئی مُوہنی شکل وہ چاند سی
چُوڑیوں کی کھنک
اور پائل کی چھن چھن سے چھنتی ہُوئی
کیسی پیاری ہنسی
تِس پہ سکھیوں کی وہ چھیڑ کہ
آئینے سے بھی نظریں ملائی نہیں جا سکیں !

شامیانے کے پرلی طرف،
وقت کے جبر کے سامنے،
چُپ کھڑی مامتا ——
جس کے چاروں طرف
تشنہ ہونٹوں، گرسنہ نگاہوں، لٹکتی زبانوں، بدن گیر
غرّاہٹوں کا عجب غول ہے

اور اسی غول سے
اپنی نازوں کی پالی کی خاطر
بڑے صبر سے
ایک مجبُور ہرنی کی صُورت وہ چُن لائی ہے
اک ذرا کم ضرر بھیڑیا!

ہاں — ابھی دُعائے نُور پڑھی جا سکتی ہے

ہاں — ابھی دُعائے نُور پڑھی جا سکتی ہے
ردِّ بلا کے اسم ابھی تک اپنی تاثیروں سے منافق نہیں ہُوئے
حرفِ دُعا میں آس کی لَو تابندہ ہے!
ٹُوٹنے والی سانسوں کا اک تار
کسی اَن دیکھے مسیحا کے ہاتھوں میں جھول رہا ہے
دو دُشمن دُنیاؤں کے مابین زمینِ بے ملکیّت کی حد پر
کوئی خزانوں جیسا ذہن
رہ رہ کے کچھ بھُول رہا ہے

آنکھوں پر اس لمحۂ آخر کی سیّال روپہلی جھلّی چڑھنے لگی ہے
جس کو چھُونے سے سُورج کے ہاتھ بھی
برف کے ہو جائیں گے
آنے والوں کی صُورت کجلانے لگی ہے
پھر بھی آنکھیں ہیں کہ دروازے سے لگی ہیں !
کوئی نجات دہندہ —— شافعِ روزِ قیامت
کوئی سب باتوں کا جاننے والا —— میرے علیم و خبیر
کوئی معجزے والا ہاتھ —— اے مُوسیٰ کے خُدا
کوئی جِلانے والی سانس —— اے ربِّ عیسیٰ
کوئی محبّت والی آنکھ —— اے محبوبِ محمدؐ !

نہیں — میرا آنچل میلا ہے

نہیں —— مرا آنچل میلا ہے
اور تیری دستار کے سارے پیچ ابھی تک تیکھے ہیں
کسی ہَوا نے ان کو اب تک چھُونے کی جرأت نہیں کی ہے
تیری اُجلی پیشانی پر
گئے دنوں کی کوئی گھڑی
پچھتاوا بن کے نہیں پھُوٹی
اور میرے ماتھے کی سیاہی
تجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کر سکتی

اچھّے لڑکے
مجھے نہ ایسے دیکھ
اپنے سارے جگنو سارے پھُول
سنبھال کے رکھ لے
پھٹے ہُوئے آنچل سے پھُول گر جاتے ہیں
اور جگنو
پہلا موقع پاتے ہی اُڑ جاتے ہیں
چاہے اوڑھنی سے باہر کی دُھوپ کتنی ہی کڑی ہو!

ایران

اک اُلوّ، اک ریچھ اور اک ہاتھی
شطرنج کے رسیا تھے
آپس میں جانی دشمن تھے
لیکن اپنے شوق کے آگے بے بس تھے
ایک ہی میز پہ بیٹھ کے پہروں کھیلتے تھے
کبھی کبھی کوئی لُومڑ، کوئی گدھا یا کوئی عقاب بھی
مہرے بدلنے میں
ان کی حسبِ حکم مدد کر دیتا تھا

کبھی بے چاری فاختہ تک پیادوں کے ساتھ پس جاتی
چھوٹی موٹی چڑیاں تو کس شمار میں تھیں
کھیل کی لَت بھی طاقت کے نشّے جیسی ہے
پہلا شب خوں عقلِ سلیم پہ پڑتا ہے
سو اک دن ایسا کرنا ہُوا کہ
سب سے بڑے شاطر کا مسئلہ
حسبِ توقع نکل پڑا
تینوں نے اپنا مستقبل سوچا
اور شیرِ ببر کو اپنا گواہ ٹھہرایا
اس کے کچھ اسباب بھی تھے

اُلّو کے بچّے جنگل میں سوتے تھے
ریچھ کو شہد کے لیے کچھار سے ہو کے گزرنا پڑتا تھا
ہاتھی کو اپنے رمبھا سمبھا کے لیے
گندم اور آلو کے کھیت چھوٹے پڑتے تھے
شیر بچارہ ـــــ بھلا اُمورِ ملک سے اس کو کب فرصت

ابھی انکار کا پہلا حرف ہی کہہ پایا تھا
تینوں نے اک دوسرے کی جانب دیکھا
اور جنابِ والا کو ہی داؤ پہ رکھ کے کھیل دیا
ہار جیت کے فیصلے سے پہلے ہی
بساطِ خُونی پر سے
فیل، پیادے، شاہ، وزیر سب ہٹے ہُوئے تھے
شیر کے ٹکڑے خانہ خانہ بٹے ہُوئے تھے !

زمیں سے رہ گیا ہے دُور آسمان کتنا
ستارہ اپنے سفر میں ہے خوش گُمان کتنا

پرند پیکاں بدوش پرواز کر رہا ہے
رہا ہے اس کو خیالِ صیادگان کتنا

ہَوا کا رُخ دیکھ کر سمندر سے پوچھنا ہے
اُٹھائیں اب کشتیوں پہ ہم بادبان کتنا

بہار میں خوشبُوؤں کا نام ونسب تھا جس سے
وہی شجر آج ہو گیا بے نشان کتنا

گرے اگر آئنہ تو اک خاص زاویے سے
وگرنہ ہر عکس کو رہے خود پہ مان کتنا

بنا کسی آس کے اُسی طرح جی رہا ہے
بچھڑنے والوں میں تھا کوئی سخت جان کتنا

وہ لوگ کیا چل سکیں گے جو اُنگلیوں پہ سوچیں،
سفر میں ہے دُھوپ کس قدر سائبان کتنا

زمین پر پاؤں تھے، قیام آسمان میں تھا
مری طرح سے وہ شخص بھی امتحان میں تھا

یہ روشنی تھی کہ اس کا چہرہ دھیان میں تھا
ستارہ سا اک چراغ میرے مکان میں تھا

کہ چاند خود آ کے ایک تارے کا نام پُوچھے
ہجومِ سیّارگاں! یہ کس کے گُمان میں تھا

مَیں اس کی آنکھوں کو دیکھتی ہُوں تو سوچتی ہُوں
نظر کا ایسا طلسم کس داستان میں تھا

مَیں اس کی کشتی سے اپنا آنچل ہٹا کے سمجھی
سفر کا بھی حوصلہ فقط بادبان میں تھا

دُعا کبھی مَیں نے مانگی تھی دونوں وقت ملتے
یہ زندگی بھر کا جھٹپٹا کب دھیان میں تھا

جُدائی کا فیصلہ تو پھر بھی ہمارا ہوتا
یہ مان بھی لیں اگر کوئی درمیان میں تھا

قدموں میں بھی تکان تھی، گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا

نکلے اگر تو چاند دریچے میں رُک بھی جائے
اس شہرِ بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

آندھی نے اُن رُتوں کو بھی بے تاج کر دیا
جن کا کبھی ہُما سا پرندہ نصیب تھا

کچھ اپنے آپ سے ہی اُسے کشمکش نہ تھی
مجھ میں بھی کوئی شخص اُسی کا رقیب تھا

پُوچھا کسی نے مول تو حیران رہ گیا
اپنی نگاہ میں کوئی کتنا غریب تھا

مقتل سے آنے والی ہَوا کو بھی کب ملا
ایسا کوئی دریچہ کہ جو بے صلیب تھا

چھتنار

اے رے پیڑ، ترے کتنے پات
اتنے
جتنے گگن میں تارے
یا جتنے بن میں پھُول
جتنی ساگر کی لہریں
جتنی مری مانگ کی دُھول؟
تیری سُندر ہریالی کا اور نہ چھور کوئی
جگ کی دُھوپ تری چھایا سے چھوٹی ہے

میں تیرے سایے میں جیسے جیسے سمٹتی جاؤں
اپنے دُکھتے ماتھے، جلتی آتما پر سے
شبنم چُنتی جاؤں
اے رے پیڑ، ترے کتنے پات؟

سبھی گناہ دُھل گئے سزا ہی اور ہو گئی
مرے وجود پر تری گواہی اور ہو گئی

رفوگرانِ شہر بھی کمال لوگ تھے مگر
ستارہ ساز ہاتھ میں قبا ہی اور ہو گئی

بہت سے لوگ شام تک کواڑ کھول کر رہے
فقیرِ شہر کی مگر صدا ہی اور ہو گئی

اندھیرے میں تھے جب تلک زمانہ سازگار تھا
چراغ کیا جلا دیا ہوا ہی اور ہو گئی

بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو
وہ گُل کھِلے کہ شوخئ صبا ہی اور ہو گئی

نجانے دُشمنوں کی کون بات یاد آ گئی
لبوں تک آتے آتے بد دُعا ہی اور ہو گئی

یہ میرے ہاتھ کی لکیریں کھل رہی تھیں یا کہ خود
شگن کی رات خوشبوئے حنا ہی اور ہو گئی

ذرا سی کرگسوں کو آب و دانہ کی جو شہ ملی
عقاب سے خطاب کی ادا ہی اور ہو گئی

سحاب میں تھی تو وہ بھی صبا مثال ہی تھا
کسی کے واسطے رُکنا ذرا محال ہی تھا

ہزار آئینے جس جا ہوں روکشِ خورشید
نگاہ بھر کے اُسے دیکھنا کمال ہی تھا

یہ کیا کہ ہلنے لگے قصر و کاخِ پرویزی
گدائے عشق کے کیسے میں اک سوال ہی تھا

بچھڑ کے وہ مجھے لوٹا گیا ہے میرا وجود
یہ سانحہ مرے حق میں تو نیک فال ہی تھا

پرند اپنی رضا سے زمین پر اُترا
وگرنہ ایسی ہَوا تھی نہ ایسا جال ہی تھا

ہرا رکھا مجھے جس نے بہ وصفِ چارہ گراں
وہ معجزہ مرا اندوہِ اندمال ہی تھا

قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی تھی
پر میں کیا کرتی کہ زنجیر ترے نام کی تھی

جس کے ماتھے پہ مرے بخت کا تارہ چمکا
چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی تھی

میں نے ہاتھوں کو ہی پتوار بنایا ورنہ
ایک ٹوٹی ہوئی کشتی مرے کس کام کی تھی

وہ کہانی کہ ابھی سوئیاں نکلی بھی نہ تھیں
فکر ہر شخص کو شہزادی کے انجام کی تھی

یہ ہوا کیسے اُڑا لے گئی آنچل میرا
یوں ستانے کی تو عادت مرے گھنشام کی تھی

بوجھ اُٹھائے ہوئے پھرتی ہے ہمارا اب تک
اے زمیں ماں! تری یہ عُمر تو آرام کی تھی

پلکیں نہ جھپکنی تھیں کہ گفتار عجب تھی
آنکھوں کے لیے ساعتِ دیدار عجب تھی

خاموش تھے لب، صورتِ اقرار عجب تھی
کیا کہتے صفائی میں کہ سرکار عجب تھی

پھر جمنے لگے دیکھ، مرے پاؤں زمیں پر
غربت میں ترے شہر کی دیوار عجب تھی

امکانِ بہاراں سے بھی دل کٹنے لگا تھا
اور برگِ تمنّا بھی کچھ دھار عجب تھی

صحرا میں پلٹ کے میں کسے دیکھتی لیکن
آواز سی اک زمزمہ آثار عجب تھی

جھکتی ہی گئی زعم میں دیوار کے اس پار
تقدیر تری شاخِ ثمردار عجب تھی

اک لمحۂ پرّاں کی بھی قیمت نہیں چھوڑی
یہ سلطنتِ درہم و دینار عجب تھی

دستار کے بل گن کے جہاں ملتی ہو عزّت
اس شہر میں توقیرِ سخن کار عجب تھی

ہوا نژاد اور آج ہے گوشہ گیر ایسا
رگِ گلو میں ہُوا ہے پیوست تیر ایسا

نہ آپ کھُلتا نہ میرا احوال پوچھتا ہے
رہِ وفا میں یہ مل گیا کون میرؔ ایسا

بندھے ہُوئے ہاتھ کا بھی اس کو ملال کب ہے
شریکِ پرواز کر رہا ہے اسیر ایسا

نہ مٹ سکے گا کوئی مرے شیشہ گر سے کہہ دے
جو فاصلہ پڑ گیا دلوں میں لکیر ایسا

میں دونوں ہاتھوں کو چھوڑ کر چل رہی ہوں پھر سے
سرِ ارادہ کھڑا ہے اک دستگیر ایسا

چٹان چھوڑ کے شاہیں سرِ نہال آیا
اور عُمر بھر کی ریاضت پہ خاک ڈال آیا

سگانِ راہ و طفلانِ شہر کیا کرتے
فقیہہِ وقت تو دستار خود اُچھال آیا

ستارہ پہلے کبھی اس قدر نہ تھا روشن
یہ کون ہاتھ مرے بخت کو اُجال آیا

زمانے نے جسے بے تیشہ کر دیا تھا کبھی
پہاڑ کاٹ کے خود راستہ نکال آیا

یہی نہیں کہ مجھے اس نے تھام رکھا ہے
مرا خیال بھی اس کو کبھی سنبھال آیا

ستارہ داں! تُو مرا زائچہ دوبارہ دیکھ
ترے کہے میں نہ آیا، عجیب سال آیا

یہ کس کا سامنا کرنے سے حرف لرزاں ہیں
سخن شناسوں میں یہ کون باکمال آیا

کفِ گلاب سے خوشبو ہی چُن سکا تو بہت
جو میرے گھر میں ہمیشہ ہَوا مثال آیا

کوئی ستارہ مرے ساتھ چلنے لگا
سفر میں جیسے ہی مجھ کو ترا خیال آیا

بہاؤ تیز تھا طوفانِ ابر و باد بھی تھا
فصیلِ شہر سے دریا کو کچھ عناد بھی تھا

غُبار ہونے سے پہلے ہَوا کو یاد بھی تھا
سوادِ سنگ میں اک آئنہ نژاد بھی تھا

ہزار بار ہوئی بند جس پہ شہر پناہ
سُنا گیا ہے کہ وہ شخص شہر زاد بھی تھا

جو بے نیازِ ستائش بنا رہا تھا مجھے
اسی کے ہاتھ میں دیکھا تو سنگِ داد بھی تھا

ہزار ٹکڑوں میں بٹ کر بھی اس کا عکس رہی
میں آئینہ تھی، بکھرنے پہ اعتماد بھی تھا

اِک ایسے گھر کا ٹھہرنا تو معجزہ سمجھیں
جو بے ستُون بھی تھا اور کج نہاد بھی تھا

وہ باکمال کہ اتمامِ عشق جس پہ ہُوا
بنامِ حسن اِسے حقِّ اِجتہاد بھی تھا

قضا نے مرے نام کی لوح بھر دی
مری جان! تو نے بہت دیر کر دی

زمیں کرۂ زمہریری میں آئی
فضا میں ہے پت جھڑ سے پہلے کی زردی

قفس کی تو خود تیلیاں مُڑ گئی ہیں
پرندے کو کس نے نویدِ سفر دی

یہ کیسے شکاری نے جکڑا ہے مجھ کو
کہ خود میں نے اُڑنے کی خواہش کتر دی

ہوائے زمستان نے کیا گُل کھلائے
دمِ واپسیں شاخ کی گود بھر دی

اسی سے طلب حرفِ آخر کی رکھوں
وہی جس نے توفیقِ عرضِ ہُنر دی

ہَوا کی طرح سے نہیں اختیاری
کسی بے ٹھکانہ کی آوارہ گردی

محبّت کی تاریخ میں کب نئی ہے
کسی آبلہ پا کی صحرا نوردی

حسابِ عداوت بھی ہوتا رہے گا
محبّت نے جینے کی مہلت اگر دی

مَیں پھر خاک کو خاک پر چھوڑ آئی
رضائے الٰہی کی تکمیل کر دی

شام ! مَیں توری گیّاں چراؤں

آنکھ جب آئینے سے ہٹائی
شام سُندر سے رادھا مل آئی
آئے سپنوں میں گوکل کے راجہ
دینے سکھیوں کو آئی بدھائی
پریم جل خوب گاگر میں بھر لُوں
آج بادل نے مایا لُٹائی
کس کو پنگھٹ پہ جانے کی ضد تھی
کس سے گاگر نے بِنتی کرائی

اوک سے پانی بہنے لگا تو!
پیاس گِردھر کی کیسے بُجھائی
اب تو جل کا ہی آنچل بنا لوں
پیڑ پر کیوں چُنریا سُکھائی
اسی بالک سے نِندیا ملے گی
جس نے ماتھے کی بِندیا چُرائی
رنگ ڈالی مری آتما تک!
کیا منوہر کے من میں سمائی
میَں نے سکھیوں کو کب کچھ بتایا
بَیری پائل نے ہی جا لگائی
گوپیوں سے بھی کھیلیں کنھیّا
اور ہم سے بھی میٹھی لڑائی
کوئی خوشبُو تو اچھی لگے گی!
پھُول بھر بھر کے آنچل میں لائی
شام! میَں توری گیّاں چراؤں
مول لے لے تُو میری کمائی

کرشن گوپال رستہ ہی بھولے
رادھا پیاری تو سُدھ بُھول آئی
سارے سُر ایک مُرلی کی دُھن میں
ایسی رچنا بھلا کس نے گائی؟
کیسا بندھن بندھا شام مورے
بات تیری سمجھ میں نہ آئی
ہاتھ پھُولوں سے پہلے بنے تھے
یا کہ گجرے سے پھُوٹی کلائی!

A WOMAN'S PRIDE

اس کی ہتھیلی پر میرے آنسُو
کتنے اچھّے لگتے ہیں
جیسے صبح سویرے
کنول کی پنکھڑیاں
شبنم سے جگمگ کرتی ہوں
موتی جیسی شبنم ——
پھُول کی آنکھوں میں جا کر ہیرے کی کنی بن جاتی ہے
قطرہ قطرہ دل کٹتا ہے
خوشبُو دھیرے دھیرے تن میں پھیلتی ہے
شبنم پھُول کے رنگ میں آخر رنگ جاتی ہے
ننھّے ننھّے چراغوں کی لَو بڑھتی ہے تو
اُس کا چہرہ پہلے سے بڑھ کر روشن لگنے لگتا ہے
اُس کی آنکھوں میں میرے آنسُو
کتنے اچھے لگتے ہیں!

شب وہی لیکن ستارہ اور ہے
اب سفر کا استعارہ اور ہے

ایک مٹھّی ریت میں کیسے تھے
اس سمندر کا کنارہ اور ہے

موج کے مُڑنے میں کتنی دیر ہے
ناؤ ڈالی اور دھارا اور ہے

جنگ کا ہتھیار طے کچھ اور تھا
تیر سینے میں اُتارا اور ہے

متن میں تو جُرم ثابت ہے مگر
حاشیہ سارے کا سارا اور ہے

ساتھ تو میرا زمیں دیتی مگر
آسماں کا ہی اشارہ اور ہے

دُھوپ میں دیوار ہی کام آئے گی
تیز بارش کا سہارا اور ہے

ہارنے میں اک اَنا کی بات تھی
جیت جانے میں خسارہ اور ہے

سُکھ کے موسم اُنگلیوں پر گن لیے
فصلِ غم کا گوشوارہ اور ہے

دیر سے پلکیں نہیں جھپکیں مری
پیشِ جاں اب کے نظارہ اور ہے

اور کچھ پل اُس کا رستہ دیکھ لوں
آسماں پر ایک تارہ اور ہے

حد چراغوں کی یہاں سے ختم ہے
آج سے رستہ ہمارا اور ہے

اس کی ثنا میں حدِ بیاں سے نکل چکا
دل کا یہ حال ہے تو یہاں سے نکل چکا

اک حرفِ تلخ میری زباں سے نکل چکا
کیا عذر ہو کہ تیر کماں سے نکل چکا

بانٹی تھی جس نے عام معافی کی خود نوید
وہ راتوں رات شہرِ اماں سے نکل چکا

اب زندگی چراغ بکف آئی بھی تو کیا
اک آدمی تو کون و مکاں سے نکل چکا

آنکھوں نے بھی یہ جان لیا ہے کہ کوئی شخص
اک خواب تھا کہ عرصۂ جاں سے نکل چکا

چھڑانا سہل ہو گیا ہے ہات درمیان میں
خُدا کا شکر پڑ رہی تھی رات درمیان میں

عجب بساط ہے کہ جیتنے کا ذکر ہی نہیں
فریق دونوں چاہتے ہیں مات درمیان میں

اشارہ کُوچ کا تو ہو چکا ہے دیر سے مگر
بچھا رکھی ہے زندگی نے گھات درمیان میں

فصیلِ شوق پر کمند ڈالنا تو کچھ نہ تھا
مگر کہ پڑ رہا تھا شہرِ ذات درمیان میں

کُھلا یہ بعدِ گفت گو کہ حاصلِ سخن رہی
وہی جو کٹ رہی تھی ایک بات درمیان میں

ابھی تو سات قحط اور سات بارشیں بھی ہیں
یہ کون مانگنے لگا نجات درمیان میں

بادباں کُھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
مَیں سمندر دیکھتی ہُوں تم کنارہ دیکھنا

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مُڑ کر دوبارہ دیکھنا

کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسپا ہُوئے
ان ہی لوگوں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا

جب بنامِ دل گواہی سر کی مانگی جائے گی
خوں میں ڈوبا ہوا پرچم ہمارا دیکھنا

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی ہارنے میں کیا خسارہ دیکھنا

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمہارا دیکھنا

ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

کیسا ثبات ہے کہ روانی بھی ساتھ ہے
واپس ہیں اور ناؤ میں پانی بھی ساتھ ہے

آسیب کون سا ہے تعاقب میں شہر کے
گھر بن رہے ہیں، نقلِ مکانی بھی ساتھ ہے

یونہی نہیں بہار کا جھونکا بھلا لگا
تازہ ہوا کے، یادِ پرانی بھی ساتھ ہے

ہر قصّہ گو نے دیدۂ بے خواب سے کہا
اِک نیند لانے والی کہانی بھی ساتھ ہے

ہجرت کا اعتبار کہاں ہو سکے کہ جب
چھوڑی ہوئی جگہ کی نشانی بھی ساتھ ہے

لیڈی آف دی ہاؤس

سبز ریشمی پردے
اور زرد غالیچہ
کارنیس کے اُوپر
صادقین کی تصویر
مغربی دریچے سے
اک ذرا قریں ہو کر
قیمتی پیانو ہے
پھول دان اس جانب
میری جان اُس جانب

بچے سو چکے ہیں کیا؟
تم بھی تھوڑا دم لے لو
پھر یہ کام کر لینا
خوب یاد آ گیا
شام سے ذرا پہلے
کچھ سنگھار کر لینا

میرے نرم دل محبوب!
میری خوشنما آنکھیں
جن کے شبنمی آنسو
تیرے مُسکراتے لب
چُومتے نہیں تھکتے
کیا اگر تری ہوتیں
(تیری ملکیت ہوتیں)
اس قدر حسیں لگتیں
تیرا دل یونہی دُکھتا

مجھ پہ کیا ترس کھانا
میرا کوئی آقا ہو
نام میں بھلا کیا ہے
اس کی دی ہُوئی چھت کا
بوجھ مجھ کو ڈھونا تھا
اور عُمر بھر میرا
یونہی صرف ہونا تھا

DEMONETIZATION

قدروں کے نمبر منسُوخ ہُوئے
شہر میں کچھ ایسی ٹکسالیں پائی گئی تھیں
جن میں سچ کا چہرہ جھوٹ سے بڑھ کر روشن ڈھلتا تھا
سکّوں کی نیّت میں کھوٹ بہت کم ہونے لگا تھا
وقت کی اصل شناس دہکتی بھٹّی میں
سونے اور پیتل کی پرکھ اب تک ممکن تھی!

بازاروں میں لیکن جیسی گرانی تھی
اس عالم میں
افراطِ خواہش، تفریطِ وقت کے ساتھ
نقدِ جاں کی ارزانی ہی ممکن تھی!
درہمِ خودداری، دینارِ عزّتِ نفس
کوڑیوں کے بھی مول نہ نکلے
سامانِ آسائش سے آراستہ دوکانوں کے آگے
پھیلے ہُوئے ہاتھوں کی بھیڑ لگی ہے
اور پھیلی ہوئی ہتھیلی کا مذہب ہی کیا؟

اچھا ہُوا
جوایسی ٹکسالوں پہ چھاپے مارے گئے
اور سچائی، نیکی اور عفو اور خودداری کا خزانہ
بحقِ کذبِ زمانہ ضبط ہُوا

خلقِ خُدا نے سُکھ کا سانس لیا ہے
اب ہر شخص قریبی مذبح خانے سے
اپنے اپنے حافظے کی خودکار تجوری میں رکھی
ان منسُوخ شدہ قدروں کے بدلے
جو جی چاہے لے سکتا ہے
چھُری، کلہاڑی یا رسّی!

ٹکٹکی

کیا وہ شہر میں داخل ہونے والا پہلا شخص تھا
یا اس بستی کے آدابِ مسافرداری ہی ایسے ہیں
ابھی تو اس نے کسی شجر کی جانب بھی کم ہی دیکھا تھا
شہر پناہ پہ استادہ پہرے داروں میں
آج کا لفظِ رہداری کیا طے پایا تھا
جس کے لیے
سچ کی پہچان اتنی مشکل تھی !

شاہِ وقت نے ایسا کون سا خواب بھلا دیکھا تھا
جس پر
خوف کی بوڑھی کاہنہ نے
راتوں رات پیمائشِ عرضِ گلو کی منادی کر دی ہے
شہر کے بیچوں بیچ
صلیبِ خوں آشام گڑی ہے
اور اناڑی ہاتھوں سے بننے والا اک حلقہ
اپنے نصف قطر تک کھنچنے والا ہے
اک جھٹکا
اور خوابِ نحس کا صدقہ اُتار لیا جائے گا
لیکن — اک پل
کوئی مشیرِ باتدبیر
اپنے مقدّس آقا کو یہ بھی تو دکھائے
چشمِ عالم کو کیسی ٹکٹکی لگی ہے !

روزِ سیاہ

کیا سُورج نکلا ہے ؟
ہر آتے جاتے سے
میرا آج یہی سوال رہا ہے
جانے میرے سوال میں کیا آسیب نظر آتا ہے
کہ ہر رہگیر
نہایت تیز تیز قدموں سے گلی سے دُور نکل جاتا ہے
یا پھر
اُلٹے پاؤں وہیں واپس ہو جاتا ہے
جس کُوچے میں شہر کے سب مشہور کفن گر رہتے ہیں

مَیں نے اپنے ظاہر اور باطن کی سب آنکھوں کو مل کر
دیکھ لیا ہے
روشنی کی ننّھی سی کِرن بھی
مجھے سجھائی نہیں دیتی
کیا اس عُمر میں آ کر مجھ کو سُورج مکھی ہُوا ہے
یا میرے وجدان کا کہنا سچ ہے
کہ سُورج قتل ہُوا ہے !

اُونٹ کا حافظہ رکھنے والے

میرا قبیلہ بڑا عجب ہے
اپنا نسب صحرا گردوں سے ملاتا ہے
اپنے خیمے ریگِ رواں پہ لگاتا ہے
رزق اپنا سانپوں سے چھین کے لاتا ہے
موت کے ڈر سے چھوٹنے والوں کی نفرت میں
ایک ہزار رطل انسانوں کے بدلے
ایک اُونٹ سے پیار زیادہ ہے
صدیوں کی ہمراہی نے
راکب و مرکب میں ایسی ہم آہنگی پیدا کر دی

دونوں مزاجوں کے مابین
کوئی خطِ تفریق نہیں کھینچ سکتا ہے
تیز روی کے ساتھ غلاموں جیسا تحمّل مرکب میں
اور راکب کی پشت پہ اک کوہان
(بظاہر نظر نہ آنے والا)
رزق اندوزی اور اطاعت کے ہمراہ
ہر عورت اپنے مُردہ وارث کی آنکھوں کی پُتلی میں
جمی ہوئی تصویر کو ڈھونڈنا جانتی ہے
اور موقعہ پا کر ہر مرد
اپنے تیز مزاج مربّی کی ہڈیاں چبا سکتا ہے
میرے قبیلے کی بولی میں
لفظِ عفو نہیں ہوتا!

بارشوں کی کچھ نظمیں

(۱)

نوید کوئی بنامِ موسم
نہ تہنیت کوئی چشمِ نم کو
نہ مُسکرانے کا تھا سبب کچھ
مگر ملے تو
خوشی چھُپائے نہ چھُپ رہی تھی
ہم اپنی آواز سن کے حیران ہو رہے تھے
ہمارے لہجے میں
رات بھر ہونے والی بارش کھنک رہی تھی!

(۲)

پیروں کی مہندی مَیں نے
کس مشکل سے چھڑائی تھی
اور پھر بیرن خوشبُو کی
کیسی کیسی بِنتی کی تھی
پیاری دھیرے بول
بھرا گھر جاگ اٹھے گا
لیکن جب اس کے آنے کی گھڑی ہُوئی
صُبح سے ایسی جھڑی لگی
عُمر میں پہلی بار مجھے
بارش اچھی نہیں لگی!

(۳)

بارش اب سے پہلے بھی کئی بار ہوئی تھی
کیا اس بار مرے رنگریز نے چُنری کچّی رنگی تھی
یا تن کا ہی کہنا سچ کہ
رنگ تو اس کے ہونٹوں میں تھا!

(۴)

بارش میں کیا تنہا بھیگنا لڑکی !

اسے بُلا جس کی چاہت میں

تیرا تن من بھیگا ہے

پیار کی بارش سے بڑھ کر کیا بارش ہو گی

اور جب اس بارش کے بعد

ہجر کی پہلی دُھوپ کھِلے گی

تجھ پر رنگ کے اِسم کُھلیں گے

ایک اُداس نظم

ایک طرف سہاگ ہے

اور دوسری طرف

رُوح کو جلانے والی آگ ہے

خود پہ برف گرتے دیکھتی رہوں

کہ روشنی کا ہاتھ تھام لُوں

اے خدائے آب و نار

میرا فیصلہ سُنا

زندہ دفن ہوں

کہ زندگی کا ہاتھ تھام لُوں ؟

ایک معقول نکاح

ایک روز بہرام بادشاہ نے ایک اُلّو کی آواز سُنی تو موبذان حکیم سے پوچھنے لگا، کیا سمجھتے ہو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ جی ہاں، ایک نَر بُوم کسی مادہ بُوم سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے مہر میں بیس ویران گاؤں کا مطالبہ کرتی ہے۔ نَر بُوم اس شرط کو قبول کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر بہرام بادشاہ کی حکومت کچھ دن اور رہ گئی تو تُو بیس ویران گاؤں کا مطالبہ کرتی ہے، مَیں تجھ کو ہزار ویران گاؤں دوں گا۔

(مسعودی)

تو فی الوقت مہرِ مؤجل ہی کافی ہے
فکرِ معجّل تو تب ہو
کہ مطلوبہ ویرانیاں مُشتبہ ہوں
یہاں تو مکانات کچھ ایسی سرعت سے کھنڈرات میں ڈھل رہے ہیں
کہ ہم سات پُشتوں تک اپنے بسیرے کی فکروں سے آزاد ہو جائیں گے
اب نہ کھیتوں میں فصلوں کی ہے بدشگونی
نہ آنگن میں گڑیا لیے کوئی بچّی

نہ پنگھٹ پہ گاگر چھلکنے کی ناخوشگواری
نہ چوپال پر بے تُکی گفتگو
گِدھوں کا نمائندہ پہلے ہی مجھ کو کسی جشن کا کارڈ پہنچا گیا ہے
جہاں بعدِ اکل و شرب
غیر معلوم مدّت تلک
محفلِ رقص برپا رہے گی
سُنا ہے کہ چمگادڑوں کا بھی اپنا الگ طائفہ زیرِ ترتیب ہے
کہ جس کو ولایت گہِ مرگ میں
فتح کا گیت گانے کا اعزاز بخشا گیا ہے
تباہی کے قاصد، مری جاں، مرے سبز پا
خُداوندِ ابلیس تیرے ارادوں میں برکت کرے
کتابِ نحوست سے نکلی ہوئی تیری بدفال کو
حافظِ خوش دہن کی طرح وصفِ تکمیل دے
دیہہ موعودہ کی ممکنہ دسترس دیکھ کر
نان و نفقہ کی مجھ کو بھلا فکر کیا

غم کا موضع

اداسی کی تحصیل

تنہائی کا پرگنہ

مری عُمر بھر کی کفالت کو کافی رہیں گے

مرے بُومِ نر حاجب بارگاہِ حماقت

قاضیِ شاہ بہرام کو حُکم ہو

صیغۂ عقد پڑھ!

آتشِ جاں سے قفس آپ ہی جل جانا تھا
قُفلِ زنداں! ترا مقسُوم پگھل جانا تھا

جس کو اک نسل نے سینچا تھا لہُو سے اپنے
اک نہ اک روز تو اس پیڑ کو پھل جانا تھا

وقت سے پہلے کبھی شام نہ یُوں آ لیتی
مُنہ اندھیرے ہی ہمیں گھر سے نکل جانا تھا

ہارنے والوں سے سمجھوتا کہاں ممکن تھا
حرف ملتے بھی تو مفہُوم بدل جانا تھا

کس کو ٹھہرائیں گے میثاقِ محبّت میں فریق
ہم نے خود کو بھی ارادے کا اٹل جانا تھا

اس نے ہی پہلی ہوا میں مرا دامن تھاما
جس دیے کو کسی نیکی کا بدل جانا تھا

وقت کی اتنی کمیں گاہوں سے ہو آئی ہے
زندگی! اب تو کسی طور سنبھل جانا تھا

وہ تو کہیے کہ کھُلی آنکھ رکھی نیند میں بھی
ورنہ ہم شب کا کوئی وار تو چل جانا تھا

فصل بر وقت نہ کٹتی جو سروں کی پروین
آسمانوں نے زمینوں کو نگل جانا تھا

کسے خبر ہے کہ کیا رنج و غم اُٹھاتے ہیں
تراش کر جو زباں کو قلم اُٹھاتے ہیں

قرار دادِ محبّت تو کب کی فسخ ہوئی
فریق آج یہ کیسی قسم اُٹھاتے ہیں

زمیں کی پُشت تحمّل سے دوہری ہو جائے
اگر وہ بوجھ اُٹھائے جو ہم اُٹھاتے ہیں

مثالِ دُردِ تہِ جام ہیں کہ بیٹھ کے بھی
اک اور حشر پسِ جامِ جم اُٹھاتے ہیں

ہمیں بُجھانے کو اندر کا حبس کافی ہے
ہَوا مزاجوں کا احسان کم اُٹھاتے ہیں

وہاں بھی ہم تو ستارہ سوار تھے کہ جہاں
بہت ہی سوچ سمجھ کے قدم اُٹھاتے ہیں

گواہی کیسے ٹُوٹتی، معاملہ خُدا کا تھا
مرا اور اس کا رابطہ تو ہاتھ اور دُعا کا تھا

گلاب قیمتِ شگفت شام تک چکا سکے
ادا وہ دُھوپ کو ہُوا جو قرض بھی صبا کا تھا

بِکھر گیا ہے پھُول تو ہمیں سے پُوچھ گچھ ہوئی
حساب باغباں سے ہے کیا دھرا ہَوا کا تھا

لہُو چشیدہ ہاتھ اس نے چُوم کر دکھا دیا
جزا وہاں ملی جہاں کہ مرحلہ سزا کا تھا

جو بارشوں سے قبل اپنا رزق گھر میں بھر چکا
وہ شہرِ مور سے نہ تھا پہ دُور بیں بلا کا تھا

کتّوں کا سپاسنامہ

رنگ تو آپ کے ہاتھ میں جا کے یُوں بول اُٹھتے ہیں

جیسے ازل سے اِسی دستِ معجز اثر کے لیے منتظر تھے

تصاویر میں کس قدر کا تنوّع ہے

لینڈ اسکیپ میں فارم اور خط کا گاتھک توازن

ادھر منجمد زندگی میں حرارت کی اور رنگ کی یہ فلیمش فضا

بی بی !

آپ ان کی باتوں میں مت آئیے

دیکھیے تو کہ اس نقش میں

دُور ہوتے ہُوئے سُرمئی رنگ کے یہ پہاڑ

جان ایک کے بتائے ہُوئے فاصلے کے اصُولوں سے کیسے

ہم آہنگ ہیں

اور یہ پورٹریٹس

رافیل اور ٹشن ایسے پچ سوچ سکتے بھلا ؟

ہمیں تو یہاں مائیکل انجلو اور ڈوچی کے اسٹروک یاد آ گئے !

او ہو، مشرقی سمت میں بھی تو دیکھیں ذرا

راہ تکتی ہوئی یہ حسینہ

اگر ریمبراں دیکھ لیتا

تو پھر نیم وا در میں نوعمُر لڑکی بنانے کی جرأت نہ کرتا

ذرا روشنی کا تناسب تو دیکھیں

یہاں آپ نے نیم فاقہ زدہ گاؤں کا رُخ کیا

تو مجھے

ڈومیا کے تخیّل سے نکھری ہُوئی درجۂ سوم کی اک سواری

بہت یاد آنے لگی

اور یہ — صُبح کے وقت اک شہر کا نیم بیدار منظر

کہ جیسے دھڑکتا رہا ہو یہاں برش وان گاگ کا

گیلری ختم ہونے سے پہلے وہاں بیضوی موڑ پر

کیوبزم کے عجب شاہ پارے سجے ہیں
پکاسو کے ہاتھوں کا سارا ہنر آپ کا تجربہ بن گیا!
اتنے بھرپور اور جاں فزا تبصروں کے لیے
آپ سب کی تہِ دل سے ممنون ہوں
مگر قبل اس کے
کہ مجھ مبتدی کے لیے
داد و تحسیں کے ٹکراؤ میں
آپ کے سر پھٹیں
ناقدینِ کرام!
اپنی باچھوں سے بہتی ہوئی
رال تو پونچھ لیں!

پوسٹ ڈنر آئیٹم

آپ کی زُلف کے ہم تو پہلے ہی گویا اسیروں میں تھے
آج تو آپ کے ہاتھ بھی چوم لینے کو جی چاہتا ہے
کہ آج آپ نے
اتنی انواع و اقسام کی لذّتیں میز پر جمع کر دیں
کہ ہم لوگ حیران تھے سب
کہاں سے شروعات ہوں
تعجب تو یہ ہے کہ اپنے سماجی فرائض میں اس درجہ
مصروف رہنے کے باوصف
آپ اتنے گھنٹے کچن میں رہیں

نوکروں کا قحط اور پھر خاص کر گُکس کی بد دماغی کے
عالم میں
اتنا بہت کچھ! پھر اتنا مزیدار کھانا پکانا!
ہمیں تو کوئی معجزہ ہی لگا
اس پہ حیران کُن بات یہ ہے
کہ اتنی تھکن پر
جبیں اور ساری پہ کوئی شکن تک نہیں
اس ڈنر کے مقابل میں بیگم فلاں کا ڈنر کچھ نہ تھا!

شکریہ

اس پسندیدگی کا بہت شکریہ
اب یہ فرمائیں، کیا پیش ہو
چائے، کافی کہ شاعر؟

بُجھ گئی آنکھ تو پیراہنِ تر کیا لائے
چاہ سے اب مرے یُوسف کی خبر کیا لائے

جب مسافر کا ارادہ ہی بھٹکنے کا ہُوا
اک چراغ اور سرِ راہگزر کیا لائے

رات ہم خانہ خرابوں کا بھرم رکھ لیتی
روشنی رہتے میں مہمان کو گھر کیا لائے

شب گزارو! وہ ستارہ تو مرا ڈوب چکا
اب دمِ صبح دُعاؤں میں اثر کیا لائے

شاخِ بدن کو تازہ پھول نشانی دے
کوئی تو ہو جو مری جڑوں کو پانی دے

اپنے سارے منظر مجھ سے لے لے — اور
مالک ! میری آنکھوں کو حیرانی دے

اس کی سرگوشی میں بھیگتی جائے رات
قطرہ قطرہ تن کو نئی کہانی دے

اس کے نام پہ کھُلے دریچے کے نیچے
کیسی پیاری خوشبُو رات کی رانی دے

بات تو تب ہے میرے حرف گُونج کے ساتھ
کوئی اُس لہجے کو بات پُرانی دے

ایک سُورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اُٹھا
آنکھ حیران ہے، کیا شخص زمانے سے اُٹھا

کس سے پوچھوں ترے آقا کا پتہ اے رہوار
یہ علَم وہ ہے نہ اب تک کسی شانے سے اُٹھا

حلقۂ خواب کو، ہی گردِ گلُو کس ڈالا
دستِ قاتل کا بھی احساں نہ دوانے سے اُٹھا

پھر کوئی عکس شعاعوں سے نہ بننے پایا
کیسا مہتاب مرے آئینہ خانے سے اٹھا

کیا لکھا تھا سرِ محضر، جسے پہچانتے ہی
پاس بیٹھا ہُوا ہر دوست بہانے سے اُٹھا

آج تک شہر کا چہرہ نہیں دُھلنے پایا
گرد کا کیسا بگولا ترے جانے سے اُٹھا

زندگی میں یہ بدن شعلۂ جوّالہ تھا
موجۂ سرد! مری راکھ ٹھکانے سے اُٹھا

ڈھال اب وقت کے ہاتھوں میں ہے اے تیر انداز
رکھ دے اک سمت کماں، ہاتھ نشانے سے اُٹھا

دل تری چشمِ مدارات سے بیعت تھا تو پھر
کس طرح بزم میں اوروں کے اُٹھانے سے اُٹھا

دودِ یک سینۂ سوزاں سے بھلا کیا ڈرنا
وہ دُھواں دیکھ جو شعلوں کے بُجھانے سے اُٹھا

دل دُکھا ہے تو کھلی ہے مرے وجدان کی آنکھ
اک شگوفہ تھا کہ شبنم کے جگانے سے اُٹھا

سونپ دے اپنا ہُنر ان کو کہ جن کا حق ہے
وقت آیا ہے کہ اب سانپ خزانے سے اُٹھا

کتبہ

یہاں پہ وہ لڑکی سو رہی ہے
کہ جس کی آنکھوں نے نیند سے خواب مول لے کر
وصال کی عمر رتجگے میں گزار دی تھی
عجیب تھا انتظار اس کا
کہ جس نے تقدیر کے تنک حوصلہ مہاجن کے ہاتھ
بس اک دریچۂ نیم باز کے سُکھ پہ
شہر کا شہر رہن کروا دیا تھا
لیکن وہ ایک تارہ

کہ جس کی کرنوں کے مان پر
چاند سے حریفانہ کشمکش تھی
جب اُس کے ماتھے پہ کھلنے والا ہُوا
تو اُس پل
سپیدۂ صبح بھی نمودار ہو چکا تھا
فراق کا لمحہ آ چکا تھا!